مشکلات القرآن

یا

قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں

از

لانا عبدالماجد دریابادی

مفسر قرآن

۳

بدالواحد اسلامک ریسرچ فونڈیشن
۱۹ - ویپری ہائی روڈ، مدراس ۳

مشکلات القرآن

یا

قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں

از

مولانا عبد الماجد دریابادی

مدیر "صدق جدید" و مفسر قرآن

ناشران:

ٹی۔ عبد الواحد اسلامک ریسرچ فونڈیشن

۱۹۔ ویپری ہائی روڈ، مدراس ۳

قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں

حکیم عبدالقوی دریابادی لکھنؤ نے اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن
مدراس کے لئے سرفراز پریس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا

ملنے کے پتے

صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ، لکھنؤ
دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

طبع اول، مارچ ۱۹۷۷ء   قیمت پندرہ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

(از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

پیش نظر مجموعہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے ان قرآنی خطبات پر مشتمل ہے جو انھوں نے شہر مدراس میں مدراس کے معزز و مخیر تاجر جناب الحاج ٹی عبد الواحد صاحب سابق ایم پی کی فرمائش و خواہش پر قلم بند کئے تھے اور نیو کالج مدراس کے وسیع ہال میں ۲۰؍ جولائی ۱۹۷۰ء سے یکم اگست ۱۹۷۰ء تک پڑھ کر سنائے گئے تھے، ان جلسوں کی صدارت کی خدمت ان سطور کے راقم کے سپرد ہوئی تھی، جس نے اس کو اپنی حیثیت سے واقف ہونے کے باوجود حاجی صاحب کے احترام، اور اپنی ایک بڑی سعادت سمجھ کر قبول کیا تھا، ان جلسوں میں مولانا کا نام سنکر نہ صرف شہر مدراس، بلکہ بنگلور، میسور تک کے اہل ذوق علماء و فضلاء، جدید دانش گاہوں کے اساتذہ و طلبہ اور مولانا کے عقیدت مند و نادیدہ مشتاق جمع ہو جاتے تھے شاید اس سے پہلے بہت عرصہ سے یہ وسیع ہال شائقین سے اس طرح نہ بھرا ہو گا جیسا کہ اس موقع پر وہ بھرا پرا نظر آتا تھا، یہ سب خطبات نہایت ذوق و شوق اور سکون و خاموشی کے ساتھ سنے گئے، راقم السطور نے اپنی پہلی تقریر میں یہ کہا کہ عن قریب وہ زمانہ آنے والا ہے، جب لوگ اس پر فخر کریں گے کہ ہم نے مولانا عبد الماجد دریابادی کو دیکھا، اور ان کی زبان سے کچھ سنا تھا، کہنے والے کو بھی اس کا احساس نہ تھا کہ یہ زمانہ اتنی جلد آ جائیگا، یہ عقیدت مند قلم جو مدظلہ لکھنے کا عادی تھا اسکو رحمۃ اللہ علیہ اور مرحوم و مغفور لکھنا پڑے گا، اس کا بھی تعلق ہے کہ یہ کتاب بعض حوادث اور مجبوریوں کی بنا پر ان

کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، اب یہ مقدمہ کی چند سطریں اس وقت لکھی جا رہی ہیں، جب ان کی وفات پر پورا ایک مہینہ بھی نہیں گذرا ہے۔

جس کتاب آسمانی کے متعلق "ثم ان علینا بیانہ" اور "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کی پیشین گوئیاں خود اسی کتاب میں موجود ہیں، اس کے لئے یہ انتظام خداوندی بالکل قرین قیاس، اور قطعاً لائق تعجب نہیں ہیں کہ اسکے اعجاز و صداقت کو ثابت کرنے کے لئے ہر دور میں غیبی اور تقدیری انتظامات کئے جاتے رہیں، علوم و فنون، فکر انسانی کی ترقیاں، نئے نئے انکشافات و معلومات جو نئے سوالات پیدا کر دیتے ہیں، اس کتاب پر ایمان رکھنے والے، اور اس سے عشق و محبت کرنیوالے، اور اس کے لیے زندگیاں وقف کر دینے والے علماء ان سوالات کے جواب دینے کا بیڑا اٹھائیں، اپنے علم و مطالعہ، تدبر فی القرآن، جدید علوم سے واقفیت، اور اپنی محنت سے قرآن مجید کے اعجاز و صداقت کو بے نقاب کریں، اس کے ابدی اصولوں اور بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان علم کی نارسائی، عقل کی کوتاہی اور فکر و نظر کی سطحیت سے جو موہوم حجابات، اور خیالی خلیج پڑ جاتی ہے اس کو دور کریں، اور ہر زمانہ میں اسکو ایک "زندہ جاوید" کتاب ثابت کریں، جب ساری دنیا کو اس کے لفظی اعجاز، اور اسکی ماوراء، الانسان بلاغت کی طرف توجہ تھی، اور اس کی صداقت کا یہی معیار سمجھا جاتا تھا، تو باقلانی، رمانی اور جرجانی نے "اعجاز القرآن" اور "دلائل الاعجاز" کے نام سے کتابیں لکھیں، اور خدا نے زمخشری، اور بیضاوی جیسے نکتہ شناس اور دیدہ ور پیدا کئے، جب علوم عقلیہ اور فلسفہ یونان کے سحر و افسون سے سارا عالم اسلام مسموم و مسحور نظر آنے لگا، تو خدا نے امام فخر الدین رازی جیسا مفسر پیدا کیا، جس نے ان عقلی و فلسفیانہ اعتراضات کا جواب دیا جو ان علوم سے کچھ سطحی النظر مقلد، قرآن مجید کے غیبی حقائق اور ماوراء عقل علوم و مضامین پر وارد کرتے تھے، ان کی تفسیر نے (جس کے ساتھ بہت سے ناقدین نے ناانصافی سے کام لیا ہے) اس مرعوبیت اور احساس کہتری کو دور کرنے میں بڑی

مفید خدمت انجام دی جس کے بہت سے وہ لوگ شکار ہو گئے تھے جن کی ایک عمر ان عقلی علوم کے مطالعہ میں گذری تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے لوگوں کے ایمان بچ گئے، اور کتنے لوگوں کے ایمان میں نئی طاقت و توانائی پیدا ہو گئی۔

اب یہ نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفۂ یونان کے بجائے، تجربی علوم، سائنس، (بالخصوص طبیعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے انکشافات و تحقیقات ہو رہی تھیں، تاریخ و جغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کر لی تھی، جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی، بہت سے قدیم تاریخی مسلمات اور جغرافیائی روایات محل نظر، بلکہ خلاف واقعہ سمجھی جانے لگی تھیں، نئی کھدائیوں اور آثار قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی تھی، اس سب سے عالم اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقہ پر ایک نئی ذمہ داری عاید ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء، متکلمین اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، اور انھوں نے علمی و عقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔

اس کار عظیم کو انجام دینے کے لیے کم سے کم ہمارے ملک میں مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمر ہمت باندھی، اور انگریزی اور اردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا، اس کام کی تکمیل کے لیے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے، اس لئے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، ان کو مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوع تھا، وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلہ سے وہ کبھی بچھڑنے نہیں پائے، اور اس تفسیری خدمت کے دوران

میں تو انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعہ سے نہ بچنے پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو، سالہا سال کی اس کوشش و مطالعہ، اور عرق ریزی کا نتیجہ ان کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے، اور یہ مضامین اس کے خاص انتخابات اور تشریحات پر مشتمل ہیں، جو انھوں نے مدراس میں اپنے خطبات کے موقعہ پر پیش کیئے، امید ہے کہ قرآن مجید کے مطالعہ کرنے والوں اور اہل ذوق کے لئے معلومات افزا اور بصیرت افروز ثابت ہوں گے اللہ تعالیٰ اس کتاب کو بھی مولانا کی علمی خدمات اور دینی حسنات میں شامل فرمائے، اور ناظرین کو زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔

ابوالحسن علی ندوی

فروری ۶۷ء

(مطبوعہ: سرفراز پریس، لکھنؤ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہِ الکریم وعلیٰ آلہٖ وازواجہٖ وصحبہٖ اجمعین

۱۱-۱۲ سال قبل جنوری ۱۹۵۸ء میں آپ کے اس شہر میں اول بار حاضری ہوئی تھی اور آپ حضرات کے اخلاص کی برکت سے ایک نئی چیز "سیرتِ نبوی قرآن مجید سے" وجود میں آگئی تھی، ابکی پھر آپ حضرات کے لطف و کرم نے کھینچا اور اگرچہ وہ اخلاق مجسم ہستی آپ کے درمیان اب موجود نہیں ہے جس کا نام افضل العلماء ڈاکٹر عبد الحق کرنولی تھا، پھر بھی اس خادم سے انکار و اعراض نہ بن پڑا اور بصارت کی روز افزوں معذوری کے باوجود حاضر ہو جانا ہی پڑا۔

اب کے موضوع ہے "مشکلات القرآن" اور دوسرا عنوان اسی پہلے عنوان کی شرح و توضیح "قرآنی مطالعہ بیسویں صدی میں" اور مقصد یہ ہے کہ آج کے طالب علم کے ذہن میں قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران میں جہاں جہاں کچھ کھٹک پیدا ہوتی ہے اسے اپنے امکان بھر رفع کر دیا جاتا رہے اور اس کا ایمان اس پر بے غبار قائم رہے۔ یہ کوشش ایسے شخص کی طرف سے ہو رہی ہے جو علم سے بے بہرہ اور عمل سے بالکل ہی کورا ہے۔ پھر بھی ایک عمر سے عادت قرآن سے لگے لپٹے پڑے رہنے کی ہو گئی ہے اور اسی لئے کچھ تھوڑی بہت کشودِ کار تو قرآن کے نازل کرنے

والے کے فضلِ بیکراں سے ہو ہی گئی ہے ــــــــــ جس کا یہ کلام ہے وہ اگر چاہے تو جاہل سے جاہل کے لئے بھی پتھر کو پانی بنا دے۔

ظاہر ہے ان معروضات میں کوئی شے بالکل نئی نہ مل سکے گی وہی چیزیں ملیں گی جنھیں اپنی اُردو تفسیر قرآن کے پہلے ایڈیشن میں عرض کرچکا ہوں اور وہ اب زیرِ طبع دوسرے اڈیشن میں مزید وضاحت کے ساتھ پیش ہو رہی ہیں، سامعین باتمکین کے لطف و کرم سے توقع ہے کہ وہ اس تکرار کو بھی بے مزہ اور خالی از نفع نہ پائیں گے۔

قرآن کی خدمت صدیوں سے ہوتی چلی آئی ہے اور بے شمار شرحیں اور تفسیریں اب تک لغوی اور نحوی، ادبی اور فلسفیانہ، فقہی اور کلامی، معقولی اور منقولی پہلوؤں سے لکھی جا چکی ہیں۔ اضافے کی ضرورت پھر بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گی۔ اللہ کے کلام کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کرلینا کس بندے کے بس کی بات ہے؟

امام فخرالدین رازی کی وفات ۶۰۶ھ ہجری میں ہوئی ہے اور ان کی کرامت کے لئے یہ کافی ہے کہ انھوں نے سارے متعلقہ علوم عصری کو قرآن کے خادم کی حیثیت سے اپنی تفسیر میں لا کھڑا کیا ہے۔

وہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا اور اب چودھویں صدی کا اختتام ہے حکمتِ الٰہی سے بعید کیا ہے کہ ان کے کسی کفش بردار کو مزید توفیق دے دے کہ انھیں کے دکھائے ہوئے راستے پر پُرانے علوم کو نئے سے بدل دے۔

بہرحال ایک خام کار سے جو کچھ بن پڑا آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے اللہ انھیں حُسنِ قبول عطا فرمائے اور اب آپ کی اجازت سے وہ معروضات پیش ہوتے ہیں۔

اگست ۱۹۷۰ء

عبدالماجد

٭٭٭

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلا خطبہ

(۱)

سورۃ البقرہ چوتھے رکوع کے شروع میں آیت نمبر ۳۰ آتی ہے

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

"اور وہ وقت بھی یاد کے قابل ہے جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں، وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں، اللہ نے فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔"

ظاہر ہے کہ جس وقت کا یہ مکالمہ ہے اللہ کی جناب میں ایک نوری مخلوق فرشتہ کے نام سے آباد تھی، اور یہ زمین بھی موجود تھی۔ اور اب اس میں ایک نئی مخلوق آباد ہونے جا رہی تھی، جس کا کام زمین پر احکام قانونی و تشریعی کا نافذ کرنا ہوگا، اور ذی شعور مخلوق کے درمیان نظم و انتظام کرنا، ورنہ قانون تکوینی و طبعی کے انصرام کے لئے تو فرشتے موجود ہی تھے، اور یہ کارخانہ حیات ان کے ذریعہ اور واسطے سے بہرحال چل ہی رہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ کسی بالکل

نئی صنف کی مخلوق کا وجود میں لانا مقصود تھا۔ اور جب ہی تو اس تخلیق کا ذکر قصد و اہتمام کے ساتھ فرمایا گیا۔ ورنہ صفت خلاقی کے اظہار سے تو قرآن مجید بھرا پڑا ہے۔ اور ساری خلقتوں کا ذکر سادہ فعل خلق کے ساتھ صیغۂ ماضی (خَلَقَ) یا مضارع (یَخْلُقُ) کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ جنت اور عرش اور کرسی تک کی محض آفرینش یا وجود کا ذکر ہے، قصدِ آفرینش کا نہیں۔ تو غرض کچھ اس اہتمام ذکر سے اور کچھ اپنی طبعی فراست اور دانائی سے فرشتوں نے بھانپ لیا، کہ اس خلیفۂ الٰہی کی ترکیب کن عنصروں سے ہوگی اور اس کی سرشت میں کیا کچھ رکھ دیا جائے گا۔ یہ سوچ سمجھ زبانِ سوال پر کھلی اور پورے آدابِ عبودیت کے لحاظ کے ساتھ کھلی، کہ کیا حضور والا ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو زمین پر فساد اور باہم خوں ریزی کرتی رہے گی؟ دراں حالیکہ ہم تو اطاعت وحمد و تسبیح میں لگے رہتے ہیں ــــــ پیرایۂ بیان چونکہ استفہامی ہے اس لئے بعض اچھے اچھے مفسرین اور محققین اس بھول میں پڑ گئے کہ سوال بطور اعتراض ہے۔ یعنی یہ آپ ایسی مخلوق کیسے وجود میں لا رہے ہیں جو آپ ہی کے لئے تکلیف اور تکدر کا باعث ہوگی۔ اہلِ تفسیر میں سے اب نام کس کس کا لیا جائے، قدما میں سے متعدد اہل نظر اسی طرف چلے گئے ہیں، اور ایک اشکال اپنی تفسیر و تعبیر سے پیدا کر دیا ہے۔ حالانکہ ایسی نوری اور معصوم مخلوق سے کسی معصیت، اور پھر گستاخانہ معصیت کے صدور کا تو امکان ہی نہیں پیدا ہوتا۔ "باغی" فرشتوں کا تخیل تمام تر مسیحیانہ ہے، نہ کہ اسلامی، بلکہ عجب نہیں کہ عیسائیوں ہی کے رابطہ اور آمیزش سے یہ خیال مسلمان علماء میں سرایت کر آیا ہو۔ــ أَتَجْعَلُ کا ہمزہ کھلا ہوا استفہامی ہے لیکن چوتھی ہی صدی کے شروع کے لُغوی ابو عبیدہ (ف سنہ ۳۱۰ھ) نے اسے صاف کر دیا کہ:۔

جاء ت مع لفظ الاستفهام ولكن معناه الايجاب (اعجاز القرآن)

"ہمزہ گو لفظاً استفہامی ہے لیکن معناً کام ایجاب کا دیتا ہے۔"

اور اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کلام میں کوئی پہلو طنز یا اعتراض کا نہیں، بلکہ یہ مبنی ہے تمام تر وفورِ عبودیت اور فرطِ نیازمندی پر اور مرادف ہے اس کے کہ آخر ہم غلامانِ بارگاہ کس دن، اور کس خدمت کے لئے ہیں؟ جو ارشاد ہونا ہے، ہم ہی سے ہو، نہ کہ اس نئی مخلوق سے جو اپنی سرشت اور طبیعت کے لحاظ سے یقیناً گرانیٔ طبع کا باعث ہوگی۔

مفسر جلیل حافظ ابن کثیر کے ہاں ہے:

لیس علی وجہ الاعتراض علی اللہ وعلی وجہ الحسد لبنی آدم کما یتوھمہ بعض المفسرین

"اس میں نہ کوئی اعتراض ہے اللہ تعالیٰ پر اور نہ حسد ہے بنی آدم پر، جیسا کہ کسی کسی مفسر کو وہم ہو گیا ہے۔"

اور اس سے ملتی ہوئی عبارت قاضی بیضاوی کی بھی ہے

ولیس اعتراض علی اللہ تعالیٰ ولا طعن فی بنی آدم علی وجہ الغیبۃ فانھم اعلیٰ من ان یظن بھم ذلک

اور سب سے بڑھ کر تشفی بخش اس سلسلہ میں وہ تحریر ہے جو ہمارے شیخ وقت مفسر تھانوی نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں فرمائی ہے، ملاحظہ ہو:۔

"مطلب یہ ہے کہ ہم سب کے سب آپ کے فرماں بردار ہیں، اور ان میں کوئی مفسد وسفاک بھی نہ ہوگا، اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لوگ لگ لپٹ کر اس کو انجام دے لیں گے۔ یہ سب لوگ اس کام کے نہ ہوں گے ان میں سے جو مطیع ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے، مگر جو مفسد و ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ اس کام کو انجام دیں خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کوئی کام کا اہل نہ ہوگا۔ اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے"

(ختم ہوئی مفسر تھانوی کی بات)

حکایت کا حکیمانہ خاتمہ فرشتوں کے اس اعتراف پر ہوتا ہے کہ بیشک طرح طرح کی مخلوقات کی ضرورتوں کا، اور پھر ہر ایک کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا پورا علم بھی تو تجھ ہی کو ہو سکتا ہے۔ ہمارے تھوڑے سے اور محدود علم کو نسبت ہی تیرے غیر محدود اور بے پایاں علم سے کیا ہو سکتی ہے۔ حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرپور بے شک تیرا ہی ہر حکم اور ہر فیصلہ ہو سکتا ہے —— قرآنیات کے طالب علم کو شروع میں ایک دشواری یہ پیش آئی، لیکن قرآن ہی کی برکت سے بحمد اللہ حل بھی ہو گئی۔

۲

اسی طرح تیسرے رکوع کا شروع حکم توحید سے ہوتا ہے، اور اس کے مابعد کی آیت میں بیان ایجاز و اجمال کے ساتھ خلقت کائنات کا ہے:

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"وہ وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور آسمان کو چھت اور اس نے اُتارا آسمان سے پانی۔ اور پھر (اس نے) تمہارے لئے غذا کو پھل پیدا کر دیے۔ سو تم اللہ کا (کوئی) ہمسر نہ ٹھہرانا۔ اور تم جانتے (بوجھتے) بھی ہو۔"

یہاں زمین و آسمان کی نہ ہیئت کا بیان ہو رہا ہے، نہ ان کی ماہیت ارضیاتی و فلکیاتی، ان علمی اور فنی یا سائنسی پہلوؤں سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ قرآن نے یہاں دونوں کا ایک ایک وصف امتیازی چن لیا۔ اور ان ہی کے بیان پر اکتفا کر لی۔ زمین کا وصف تو یہ

بیان کیا کہ وہ انسان کے لئے بمنزلہ فرش ہے۔ وہ گول ہو تو، اور چوکھنٹی ہو تو، ہر صورت میں انسان کے پیروں کے نیچے ہے، انسان اس پر چاہے چلے پھرے، بیٹھے لیٹے دوڑے یا سوئے ہر حال میں یہ اس کے نیچے فرش کا کام دے گی، اس پر جو سواری بھی اس کا جی چاہے چلائے، گھوڑے اور خچر، اور بیل اور اونٹ، اور سائیکل اور ریل اور موٹر۔ ہر حال میں وہ اسے سنبھالے رہے گی اور اس کا بوجھ اٹھائے رہے گی۔ انسانی ضرورتوں کے لئے یہ ٹھوس اور ہموار اور مسطح ہے، نہ کھردری، نہ پلپلی، نہ کھوکھلی نہ پچپچی، کہ بیٹھ جائے یا دھنس جائے۔ یا اپنے اندر نگل لے۔

اسی طرح السماء کا وصف خصوصی اس کی بلندی کو چن لیا اور الارض کی پستی یا فرشیت کے مقابل اس کی بلندی یا رفعت کو بیان کر دیا۔ کہ وہ تو انسان کے لئے بمنزلہ چھت کے ہے۔ اس کے ٹھوس اور خول ہونے سے یہاں مطلق بحث نہیں۔ بحث صرف اس سے ہے کہ وہ سب سے بلند چیز ہے۔ چھت کی طرح نسل انسانی کو ہر طرف سے ڈھانپے ہوئے۔ انسان جتنا بھی چاہے اچھلے کودے، جس بلند سے بلند پہاڑ کی چوٹی پر چاہے چڑھتا جائے ہوا میں جتنی بھی اڑان دکھائے، خلا میں زیادہ سے زیادہ قلابازیاں کھاتا رہے۔ بہرحال آسمان کے نیچے ہی رہے گا۔ کسی صورت میں اس سے باہر نکل کر نہ جا سکے گا۔

تیسری بات آیت میں یہ بیان کر دی کہ انزل من السماء ماء کہ آسمان سے پانی اسی پروردگار نے اتارا ہے۔ یہ معنی اس کے ہرگز نہیں کہ چھت کے اوپر، پانی کا لامحدود ذخیرہ کوہ قامت ٹنکیوں کے اندر محفوظ ہے۔ اور اللہ ان کی ٹونٹیاں جب چاہے کھول کر زمین پر پانی برسا دیتا ہے۔ یہ بھی اللہ کیلئے بالکل آسان ہوتا۔ سوال امکان کا نہیں، واقعہ کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کی کتابوں نے جو لمبا اور سلسلہ وار طریقہ بیان کیا ہے یعنی سمندر کے پانی کا گرمی پاکر بھاپ کی شکل میں تبدیل ہونا، اس کا بادل کی شکل

اختیار کر کے اوپر اُٹھنا، ہواؤں کے سہارے فلاں اور فلاں سمت میں منتقل ہونا اور فلاں درجہ کی حرارت پاکر پانی کی بوندیں یا قطرے بن جانا، پھر فلاں مقدار میں نازل ہونا وغیرہ۔ اس ساری داستان مفصل و مطول کا خلاصہ و ماحصل دو لفظوں میں بیان کر دینا قرآن ہی کا اعجاز ہے، اس کو درمیانی واسطوں اور سلسلۂ اسباب سے کوئی بحث نہیں۔ یہ کام تو مادی مشاہدوں اور تجربوں سے لینا تو عقل کے سپرد کر دیا گیا ہے، اور علوم طبعی کے حوالے۔ قرآن مجید نے تو صرف اتنا بتا دیا کہ پانی برسانا کام اللہ ہی کا ہے، نہ کہ کسی اور کا، جس طرح اس نے زمین کی فرشیت اور آسمان کی بلندی کی تخلیق کو اپنی جانب منسوب و مخصوص کر لیا تھا۔

چوتھی بات آیت میں یہ بتائی گہ فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ اس نے پانی کے ذریعہ تمہارے لئے غذا کو پھل اُگا دیے۔

الثمرات کے تحت میں غلّے، ترکاری، ساگ پات اور پھل پھلاری، سب ہی زمین سے اُگنے والی غذا میں آگئیں۔ سائنس کے کسی بیان سے قرآن کا کہیں ٹکراؤ نہیں۔ قرآن نے تو بس اتنا بتا دیا کہ کائنات میں جو کچھ اور جس طرح بھی ہو رہا ہے، جو کچھ بھی تمہاری آنکھیں دیکھتیں اور تمہارے حواس محسوس کرتے ہیں، یہ ساری کاریگری اور صنعت اور تخلیق دونوں عالم کے پروردگار ہی کی ہے۔ اور آیت کا توڑ اس پکار پر کیا ہے کہ:-

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

"اللہ کا ہمسر کسی کو بھی نہ ٹھہراؤ (نہ کسی انسان یا جن یا فرشتہ کو، نہ کسی چرند پرند حیوان کو، نہ کسی دریا یا پہاڑ کو، نہ کسی سائنسی فارمولے یا طبعی قانون قاعدہ کی کسی دفعہ کو) اور تم جانتے بوجھتے بھی ہو"

یعنی اتنی موٹی حقیقتیں تو عام فہم ہیں۔ انسانی فہم پر روشن و واضح۔ یہ کوئی دقیق و غامض

علمی نکتے اور عقلی اسرار و رموز نہیں۔

آفرینش کائنات و اجزاء کائنات سے متعلق قرآن کا عام انداز بیان یہی ہے کہ وہ اسباب وجزئیاتِ اسباب کی طرف نہیں جاتا بلکہ سارا زور خالق و مخلوق کے ربط و تعلق پر دیتا رہتا ہے، اور گھوم پھر کر ذہن انسانی کو اس نقطہ پر لاتا ہے کہ ایک خالق کل، ناظم کل، حاکم کل، قادر کل کو مان لینا آسان تر اور زیادہ قرین عقل ہے، یا ہزارہا ہزار وسائط کے جنجال میں پڑے رہنا؟

۳

قرآنیات کے طالب علم کو ایک اور دھچکا اس وقت پہنچتا ہے، جب وہ سورۂ بقرہ کے چھٹے رکوع کے شروع میں اس آیت پر پہونچتا ہے:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آیت ۴۷)

"اے بنی اسرائیل میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا۔ میں نے تمھیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی"۔

اور اسی مفہوم کی اور آیتیں بھی آگے چل کر قرآن مجید میں ملتی ہیں۔ بنی اسرائیل کو عام طور پر مرادف یہود کے سمجھا گیا ہے اور جس انعام کو یاد دلایا گیا ہے اس انعام سے مراد دنیوی انعام، ملک و مال، دولت و شوکت سمجھا گیا ہے۔ یہ مفہوم لے کر اب تاریخ کے اوراق سے سوال ہوتا ہے کہ یہ بے مثل و بے نظیر اقبال اس کے کس دور میں اور عالم کے کس خطہ میں یعنی کب اور کہاں حاصل رہا ہے؟ یہود کی نفس اقبال مندی میں شبہ ذرا نہیں۔ بڑے سے بڑے ملک و سلطان اس قوم میں ہوئے ہیں۔ بڑے سے بڑے ساہوکار اور سرمایہ دار اس میں گزرے ہیں۔ سوال اس کا نہیں، سوال اس قوم کے سب سے بڑھ چڑھ کر ہونے کی بابت ہے۔

کیا ایسے باقبال افراد اس قوم میں ہوئے ہیں؟ دوسری ترقی یافتہ قوموں میں نہیں ہوئے ہیں؟ سوال اس قوم کے بے نظیر ہونے کی بابت ہے۔ قرآن نے جو صراحت کے ساتھ انھیں افضل و برترین اقوامِ عالم کہہ دیا ہے تو ثبوت بیسویں صدی عیسوی کا طالب علم قرآن کے اس دعوے کا مانگتا ہے، اور نشان دہی متعین ملک و زمانہ کی چاہتا ہے۔

جواب سے پہلے دو تاریخی حقیقتیں ذہن نشین کر لیجیے اور جواب بالکل سہل ہو کر سامنے خود بخود آجائے گا۔

پہلی بات یہ کہ بنی اسرائیل کوئی مذہبی اصطلاح نہیں، یہ ایک نسلی نام ہے۔ اس قوم کا لقب، جو یعقوب معروف بہ اسرائیل بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کی نسل سے پیدا ہوئی۔ اور اپنے وطن شام سے نکل کر پھر اطرافِ عالم میں پھیلی۔ ظہور اسلام اور بعثت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں نبوت و رسالت جہاں کہیں بھی تھی نسلی و قومی ہی تھی۔ آفاقی اور تمام تر اعتقادی تو دنیا میں پہلی بار ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے ہوئی ہے۔ خاندان یعقوبؑ کی اصل فضیلت یہ تھی کہ جہاں اسے عزت و حکومت سے نوازا گیا، وہیں اس کے اندر انبیاء بھی پیدا ہوئے اور اسے شرفِ رسالت سے بھی مشرف کیا گیا۔ وَجَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ (مائدہ آیت ۲۰)، اسی معنی پر دال ہے۔

دوسری بات یہ کہ دنیوی سروری اور سرداری، ملک گیری اور ملک داری کے انعام میں، ایران و ہند، عراق و چین، یونان و مصر کے بہت سے افراد شریک و سہیم رہے ہیں لیکن شرک و مخلوق پرستی کی آلائش سے ان میں سے کوئی بھی قوم محفوظ و مستثنیٰ نہ رہی۔ آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی، انجم پرستی، مورتی پوجا وغیرہ ہر ملک میں ایک ضمیمہ علوم و فنون، تہذیب و شائستگی کا بنے رہے اور دیوتا، اوتار، بلکہ انگریزی اصطلاح میں ہیرو گاڈ (Hero God) کا عقیدہ تقریباً ہر مذہب یا دھرم کا جزو لاینفک رہا ہے۔

اور تاریخ کے دور میں صرف ایک ہی قوم عقیدۂ توحید کی علم بردار رہی، اور خالص خدا پرستی کی تلقین کرتی رہی۔

قرآن نے جس انعام خصوصی کا ذکر اس قوم کے سلسلہ میں بار بار کیا ہے اور اس میں اس کا شریک و سہیم کسی دوسری قوم کو نہیں گردانا ہے، وہ یہی نعمت توحید ہے، اور بار بار اس امتیاز خصوصی کا ذکر کر کے اس ناشکر گذار قوم کو جتایا ہے کہ صدیوں تک اس نعمت خاص کی بارش تمہارے اوپر ہوتی رہی، تم ہی کو اس دعوت کا نقیب، پشتہا پشت تک رکھا گیا ہے۔ اور اب بالآخر اتمام حجت کے بعد تمہارے مسلسل کفران نعمت کی پاداش میں یہ نعمت تمہارے خاندان و نسل سے سلب کی جاتی ہے۔ اور دین توحید آج سے بجائے نسلی یا قومی مذہب کے، ایک اسمٰعیلی پیمبر کے واسطے سے دین انسانی یا عمومی کیا جاتا ہے۔ ہر نسل و قوم کے لئے جو بھی صحیح عقیدہ کا اتباع کرے اور توحید و رسالت کا قائل ہو جائے۔ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ کے اس صحیح مفہوم پر جس کسی کی نظر پہونچ جائے گی، اس کا بجائے کسی شک و اشتباہ کے، قرآن کی تاریخیت پر ایمان کس قدر مستحکم تر ہو جائے گا!

ہمارے جو مفسرین یہود اور بنی اسرائیل کو مرادف سمجھے ان کے ہاں ایک سوال امت موسوی اور امت محمدی کے درمیان تفاضل کا پیدا ہو گیا ہے، حالانکہ دونوں کے مفہوم کا فرق اگر واضح رہے، تو سرے سے تقابل و تفاضل کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ امتِ محمدی ظاہر ہے کہ نام کسی نسل یا قوم کا نہیں بلکہ وہ تو ایک خاص عقیدہ کے ماننے والوں کا نام ہے، خواہ وہ کہیں کے باشندے ہوں اور کوئی سا بھی نسب رکھتے ہوں۔

(۴)

اسی رکوع میں ذرا آگے چل کر آیت پچاس میں بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے

یہ الفاظ ملتے ہیں:

وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٠﴾

"اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہارے لئے سمندر پھاڑ دیا، پھر ہم نے تم کو بچالیا اور فرعون والوں کو غرق کر دیا تھا، اس حال میں کہ تم دیکھ رہے تھے۔"

سوال آج کے قاری کے دل میں قدرتاً یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ کہاں کا ہے؟ اور کب کا ہے؟ ہمارے بھولے بھالے مفسرین جو جغرافیہ کے مبادی سے بھی واقف نہیں تھے اور ان کے کانوں میں نام صرف دریائے نیل کا پڑا ہوا تھا، قدرتاً یہی سمجھے کہ وہ دریا، دریائے نیل ہی ہوگا ——— یہ قیاس تمام تر ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ بنی اسرائیل جس شہر میں آباد تھے، اس کا نام توریت میں جُشن (GOSCHAN) آیا ہے۔ اسرائیلیوں کو یہاں سے شام کی طرف آنا تھا، جو اس شہر سے شمال و مشرق میں واقع تھا۔ نیل پر ان کے جا پہنچنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی، سوا اس کے کہ راستہ اس وقت بالکل ہی اُلٹا اختیار کیا ہو، شام و فلسطین تو شمال مشرق میں تھے۔ بنی اسرائیل اسی سمت چلے، لیکن بجائے اس کے کہ شمال میں ابھی کچھ اور چلے جاتے پہلے ہی مشرق کو مڑ گئے، اور جنوب میں بحر قلزم کی اس شاخ سے مڈبھیڑ ہو گئی، جو ایک دو شاخہ کی صورت میں کوئی دو میل کے عرض میں سمندر کے بائیں طرف واقع ہے، اور جسے موجودہ نقشہ میں خلیج سویز کہتے ہیں۔

بعض مغربی روایتوں میں یہ آیا ہے کہ ہجرت اسرائیل تمام تر ایک ہی مرتبہ نہیں ہوئی بلکہ مختلف چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہجرت کرتی رہتی تھیں۔ یہ روایتیں اگر کبھی پایہ ثبوت کو پہنچ جائیں تو اس وقت اس پر روشنی قرآن مجید کے لفظ نَجَّيْنَا سے پڑے گی جو باب تفعیل سے ہے، اور جس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ فعل کا بتدریج ہونا دکھاتا ہے

اس خروج یا ہجرت کے وقت راستوں پر لیمپ، لالٹین وغیرہ کی روشنی کہاں تھی،

بلکہ آج کل کی سیدھی، ہموار پختہ سڑکیں بھی موجود نہ تھیں اور یہ عجلت اور گھبراہٹ اس پر مستزاد کہ راتوں رات ہی حدودِ مصر کو پار کر لیں۔ شب کی تاریکی میں اگر اسرائیل راہ بھول گئے ہوں تو تعجب اس پر ذرا نہ کیجئے۔ فرعون کو خبر ہو گئی اور وہ خود اپنی کمان میں لشکرِ جرار لے کر تعاقب کو چڑھ دوڑا۔ زمانہ کا تعین جزم کے ساتھ مشکل ہی ہے تاہم اکثر محققین کا رجحان پندرھویں قبل مسیح کے وسط کی جانب ہے بلکہ بعض مثلاً سر چارلس مارسٹن نے تو جرأت کر کے سنہ بھی متعین کر دیا۔ ۱۴۴۷ قبل مسیح۔

(۵)

تاریخ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قرآن مجید نے تذکرہ تو بہت سے واقعات کا کر گیا ہے، کہیں صراحتاً اور کہیں اشارتاً، لیکن کم سے کم ایک واقعہ ایسا ہے جس کے لئے ذہن میں ضرور کرید پیدا ہوتی ہے، ارشاد ہو رہا ہے بنی اسرائیل ہی سے:

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ۝ (آیت ۶۵)

"تم خوب جانتے ہو ان لوگوں کو اپنے میں سے جنھوں نے سبت کے بارے میں حدود سے تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔"

عَلِمْتُمْ کے معنی خود ہی یہ ہیں کہ مخاطبین کے سامنے ان کے کسی جانے بوجھے واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے اور اس پر لَ حرفِ تاکید اور قَدْ حرفِ تاکید کا مزید اضافہ۔ گویا تاریخ اسرائیل کا کوئی خوب ہی معروف و متعارف واقعہ جس سے موجود الوقت اسرائیل کو مجالِ انکار نہیں۔ سبت یا ہفتہ کا دن ان کے ہاں بہت محترم تھا اور احترامِ سبت کے احکام ان کے ہاں نہایت درجہ تاکیدی تھے۔ ذکر لامحالہ کسی ایسے واقعہ کا ہو رہا ہے جو سبت شکنی کرنے والوں اور احکامِ سبت کی بےحرمتی

کرنے والوں پر بطور سزا کے نازل ہوا تھا، اور پھر مدتوں ان کی قوم میں یہ بطور عبرت و موعظت زبان زد عام رہا۔ کرید یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایسا اہم واقعہ کب اور کہاں پیش آیا؟ مجاہد کوئی معمولی اور متاخر شخص نہیں، تابعی ہوئے ہیں۔ اور تابعی بھی ایک ممتاز درجہ رکھنے والے ۔ ترجمان القرآن۔ ان سے یہ قول ابن جریر وغیرہ میں منقول چلا آرہا ہے کہ انسانوں کا یہ مسخ صورتاً اور جسماً نہیں ہوا بلکہ محض سیرت و کردار، عادات و خصائل کے لحاظ سے وہ ذلیل بندر بنائے گئے جیسا کہ قرآن ہی میں سورۃ الجمعہ میں یہود ہی کو گدھے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ ۔ اور راغب کے مفردات القرآن میں بھی ایک قول اسی معنی میں نقل ہوا ہے ——— اس مفہوم کو تسلیم کر کے قدرتاً واقعہ کا استبعاد از خود رفع ہو جاتا ہے اور ذہن کو کوئی خاص حیرانی نہیں رہ جاتی ۔ پھر بھی کب اور کہاں کے سوال کسی درجہ میں تو باقی ہی رہ جاتے ہیں ۔

ان دونوں سوالوں کا جواب ثقہ اور سنجیدہ اسلامی روایتوں میں ملتا ہے کہ واقعہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ کا ہے اور آپ کا زمانہ جدید تحقیق کے مطابق ۱۰۱۳ ق۔م سے لے کر ۹۷۳ ق۔م تک رہا ہے اور مقام کا نام جس کا پتہ قرآن نے حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کہہ کر سورۃ الاعراف میں دے دیا ہے یعنی ساحل سمندر پر ایلہ آیا ہے۔ توریت میں اس کا نام ایلات (Elath.) صحیفہ (استثناء باب دوم آیت ۸) اور موجودہ جغرافیہ میں اس کا نام خلیج عقبہ کا مشہور بندرگاہ عقبہ ہے ۔

(۶)

ایک بڑے اچنبھے میں مسلمان کو ڈالنے والا مقام قرآن میں وہ ہے جہاں حضرت سلیمانؑ کی صفائی کفر سے پیش کی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے، کہ:۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا (رکوع ۱۲، آیت ۱۰۲)

"سلیمان نے تو کبھی کفر نہیں کیا، البتہ شیطان کفر کرتے تھے"۔

مسلمان کو قدرتاً یہ پڑھ کر کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ سلیمانؑ جب پیغمبر برحق تھے تو یہ کہنے والی کون سی بات تھی کہ آپ کفر کے مرتکب نہیں ہوئے۔ کفر کر کے کوئی مومن ہی کب باقی رہ سکتا ہے۔ چہ جائیکہ پیمبر اس کا ارتکاب کر سکے! دل کی کھٹک بجا ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی، جب تک یہ نہ سُن لیا جائے کہ یہود و بڑے اور صاحبِ کتاب مذہبوں نے آپ کو اپنی کتاب میں نعوذ باللہ دینِ توحید سے مرتد اور بے دین قرار دیا ہے۔ عہدِ عتیق کے صحیفہ ا۔سلاطین کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا" (باب ۱۱ آیت ۴،۶)

اور اسی صحیفہ کی دو تین آیتیں اور بھی:۔

"سو از بسکہ اس کا دل خداوند کی طرف سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضب ناک ہوا، کہ اس نے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے، پھر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا" (سلاطین: ۱۱، ۹، ۱۰)

یہ اور بات ہے کہ محققین جدید کی تحقیقات بھی بائبل سے کہیں زیادہ قرآن کی تائید میں آرہی ہیں اور ان کے اصل حوالے خاکسار کی تفسیر میں درج ہو چکے ہیں۔

ضمناً قرآن مجید نے یہ بھی بتادیا کہ ساحرانہ اور کافرانہ حرکتیں آپ کے عہد میں تو شیاطین جن و انس ہی کرتے تھے، اور انھیں منسوب آپ کی جانب کر دیتے تھے۔ قرآن مجید میں یہاں لفظ شیاطین بصیغہ جمع آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد ابلیس تو ہو نہیں سکتا۔ لامحالہ شیطان مجازی ہی مراد ہوں گے۔ یعنی شیطان صفت انسان یا جنات، جو طرح طرح کی شیطانی حرکتیں کرتے رہتے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلاتے رہتے تھے سحر و کہانت، ٹونے ٹوٹکوں، نقش و گنڈوں کا زور جو یہود کے ہاں رہا ہے اس سے

اُن کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ قرآن مجید اس کی تصدیق یوں کرتا ہے:

یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ "لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے"۔ اور اس سے معاً پیشتر ہے:

وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا (کفر تو شیطان کرتے تھے) اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ کفر تو شیطان کرتے تھے اور وہی لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے۔ لیکن ایک دوسری ترکیب یہ بھی جائز سمجھی گئی ہے کہ فاعل بجائے شیطان کے یہود کو قرار دیا جائے یعنی اس فقرۂ قرآنی کو جو ذرا پہلے آچکا ہے، فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کو۔ عملاً نتیجہ اس صورت میں بھی وہی نکلتا ہے، یعنی عہد سلیمانی کے شیطان صفت یہود سحر آموزی اور سحر کے چرچے میں مشغول تھے۔

ان تصریحات کے معاً بعد قرآن مجید میں ہے:

وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ (ع ۱۲، آیت نمبر ۲۲)

"اور وہ پیچھے لگ گئے اس (علم) کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُتارا گیا تھا۔"

بابل جس ملک کا نام ہے اس کو اب عرب عراق کہتے ہیں اور اسی کا ایک قدیم نام کلدانہ یا کلدانیہ بھی ہے۔ اس کی شہرت علوم سحریہ میں اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ انگریزی میں کالڈین مرادف ہی ساحر کا ہوگیا ہے، اور دو فقروں کے عطف سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر فلسطینی اور سحر بابلی کا عروج ایک ہی زمانہ میں رہا ہو، بلکہ بیان و سباق قرآنی میں صاف گنجائش اس کی موجود ہے کہ دونوں ملکوں کے عروج سحر کا زمانہ الگ الگ ہو لیکن یہود کی مہارت سحر دونوں قسم کے سحر میں مشترک رہی ہے۔

اور وَمَا اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ میں لفظ اُنْزِلَ سے کسی کو دھوکا نہ ہو کہ یہ شرف و تعظیم کا لفظ سحر کی سی حرام چیز کے لئے کیسے لایا گیا۔ "نزول" و "انزال"

عربی میں موقع شرف و تعظیم کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تکوینی حیثیت سے جو شے بھی اللہ کے ہاں سے اور فرشتوں کے واسطے سے آتی ہے، سب پر اطلاق عام اس سے کہ وہ خیر ہو یا شر، نزول و انزال کا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ فعل رزق (روزی) کے ساتھ آیا ہے، اور ماء (پانی) کے ساتھ، اور انعام (چوپایوں) کے ساتھ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رجز (عذاب یا بلاء) کے ساتھ بھی۔ سورۂ عنکبوت کی آیت ۳۴ میں اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤى اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ ——— اور ایک سحر ہی پر کیا موقوف ہے، کائنات میں نور و ظلمت، خیر و شر، حق و باطل، طاعت و معصیت میں سے جو کچھ بھی موجود ہے سب کا وجود تکوینی حیثیت سے مسبّب الاسباب ہی کے نازل کرنے سے تو ہوا ہے۔ اور سحر کے لئے یہاں انزال اپنے اسی وسیع معنی میں آیا ہے یعنی یہ بات ان کے دل میں ڈال دی گئی، کوئی اظہارِ شرف و تکریم مقصود نہیں۔ اسی طرح کوئی حیرت فرشتوں کے ذکر پر بھی نہ کیجئے، ایک سحر کیا معنی، کفر و شرک، کوئی گندہ سے گندہ کام بھی تکوینیات کے سلسلہ میں ہو، آخر فرشتوں ہی کے واسطہ یا وسیلہ سے تو لیا جاتا ہے اور یہ امر فرشتوں کی برگزیدگی و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں۔

بابل والوں کے سحر پر علاوہ تاریخی شہادتوں کے گواہی خود عہد عتیق کی موجود ہے چنانچہ صحیفۂ دانیال (باب ۴، آیت ۳) اور صحیفۂ مکاشفہ (باب ۲۰، آیت ۵ اور باب ۱۸، آیت ۲۰) وغیرہ میں صراحتیں درج ہیں۔ اور ایک جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں کی فرد جرم کا سرعنوان یہی جرم سحر کاری تھا۔ صحیفۂ مکاشفہ میں ہے:

> "تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے، تیری جادوگری سے ساری قومیں گمراہ ہو گئیں۔ اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا۔" (باب ۱۸، آیت ۲۳، ۲۴)

قرآن مجید میں یہ سارا تذکرہ اس تاریخ اسرائیل کے ضمن میں لایا گیا ہے اور گویا یہود عرب پر

حجت قائم ہو رہی ہے کہ سحر و کہانت کی پلیدی سے تولد ہوئے ہو اور تاریخ کا کوئی سا دور ہو، یا زمین کا کوئی سا قطعہ ہو، فلسطین ہو یا بابل، تمھارے ہاتھ تو برابر اس جرم سے رنگین رہے ہیں۔

مَلَکَیْنِ (بالفتح) کی ایک قرات اگرچہ مَلِکَیْنِ بھی ہے کسرۂ لام کے ساتھ اور اس بنا پر اہلِ تفسیر کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ یہ دونوں اصلاً فرشتے نہ تھے بلکہ بشر تھے اور بادشاہ۔ اور انھیں جو دوسری روایتوں میں فرشتہ کہا گیا ہے تو صفاتی حیثیت سے۔ یعنی ان ملکوتی صفات کی بنا پر۔ لیکن جمہور کا قول اس قرات مشہور کی بنا پر ان کے فرشتے ہی ہونے کا ہے۔ اور کسی خاص تشریعی مصلحت سے کسی خاص موقع پر اور کبھی امر و نہی ہی کی تنقیح و تحقیق کی غرض سے، کسی فرشتہ کو انسانوں کے درمیان رہنے سہنے کے لئے بشری جذبات و خصائل سے موصوف کرکے بھیج دیا گیا تو اس سے کوئی بھی قباحت لازم نہیں آتی۔ خصوصاً جب کہ مقصود ہی سحر و کہانت کا ابطال و استیصال ہو۔ آخر دنیوی حکومتوں میں تو روزمرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ مجرموں کی سراغ رسی اور گرفتاری میں، اور جرائم کے قلع و قمع کی خاطر، پولیس کانسٹبلوں ہی کو نہیں، بڑے بڑے سرکاری افسروں کو بھی کیسے کیسے طریقے مجرموں ہی کے سیکھنے پڑتے ہیں اور خود کیسے کیسے مصنوعی اور نقلی جرائم کا ارتکاب کرنا ہوتا ہے۔ بات ردِ کفر سلیمانؑ سے شروع ہوئی تھی اور پھر بات میں بات نکلتی آئی، یہاں تک کہ بہت سی الجھنیں ایک ہی سلسلہ کی صاف ہوگئیں۔

— ۷ —

اسی قصۂ سلیمانی کے ضمن میں اور گویا محض اتفاقیہ اور لپیٹ میں، قرآن، اسرائیلیوں کی ایک اور بھی خصوصیت بیان کر گیا ہے اور وہ بھی سننے کے لائق ہے نہ

یہ فرشتے سحر کے گر کسی کو بلا ضرورت بتاتے ہی نہ تھے، اور جب ضرورۃً بیان کرتے

بھی تو یہ ضرور تنبیہ کر دیتے کہ ہم تو امتحان کے لئے بھیجے گئے ہیں تم کہیں واقعۃً اور عقیدۃً سحر کو نہ اختیار کر لینا، ورنہ اس طرح کافر ہو جاؤ گے۔

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ (رکوع ۱۲، آیت ۱۰۲)

"اور وہ دونوں کسی کو بھی فن کی باتیں نہ بتاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم لوگ تو بس ایک ذریعۂ امتحان ہیں، تو کہیں تم کفر نہ اختیار کر بیٹھنا۔"

"تعلیم" یہاں باقاعدہ درس دینے کے مفہوم میں نہیں محض اطلاع یعنی جتلانے چتانے، بتانے کے معنی میں (جیسا کہ صاحب معالم التنزیل وصاحب بحر المحیط وغیرہ نے کہا ہے) خود ایک قرآنی قراءتِ متواترہ میں بھی تخفیف لام کے ساتھ و مصدر اعلام سے آئی ہے۔

لیکن اس شدید وصریح انتباہی ہدایت کے باوجود بھی ایک خاص قسم کے نقش اور گنڈے یعنی میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دینے والے یہ لوگ ضرور ان سے سیکھ لیتے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ (رکوع ۱۲ - آیت ۱۰۲)

"پھر لوگ ان سے سحر سیکھ لیتے جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد اور اس کی زوجہ کے"۔

قرآن مجید کو آخر اس مخصوص نوعیت کے جھاڑ پھونک کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے جواب میں عرب کے ایک امی کے لائے ہوئے کلام کو نہیں، بلکہ یہ دیکھیئے کہ بیسویں صدی کے آغاز کے علماء یہود اور محققین اسرائیل اپنے اسلاف واجداد کے مشغلۂ سحر وساحری اور اعمال سفلیہ سے متعلق کیا کہتے ہیں، بگوش ہوش سماعت فرمائیے:۔

"سحر کی سب سے زیادہ عام و متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لئے دیا جاتا تھا۔ خاص کر وہ نقش جو ناجائز آشناؤں کے لئے لکھا جاتا تھا۔ اس قسم کے سحر کی ماہر، عورتیں ہی زیادہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر بھی سحر اور حرام کاری کا ساتھ ہی ساتھ آیا ہے"۔

یہ حوالہ ہے جیوش انسائیکلوپیڈیا کی جلد ۸، صفحہ ۲۵۵، کالم اول کا۔

۸

پارۂ اول کے ثلث کے بعد حکم استقبالِ قبلہ کی تمہید شروع ہوتی ہے۔ ابھی تک کوئی حکمِ قبلہ قرآن مجید میں نازل نہیں ہوا تھا۔ عام اہلِ مذہب اپنے اپنے خدا کو مجسّم اور کسی سمت کے ساتھ مقید، اور کسی مکان کے ساتھ مخصوص و محدود مانتے تھے اور خدا کے تلبّس سے اس خاص سمت کو بھی مقدس ماننے لگے تھے۔ قرآن مجید میں جو پہلا ارشاد اس بارے میں وارد ہوا ہے، اس میں سب سے پہلے اس غلط تصوّر کی اصلاح کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

(رکوع ۱۴ - آیت ۱۱۰)

"اللہ ہی کا مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، سو تم جدھر کو بھی منہ کرو بس ادھر ہی اللہ کی ذات ہے۔ بیشک اللہ بڑا وسعت والا، بڑا علم والا ہے۔"

یعنی کیا بحیثیت مخلوق، کیا بحیثیت مملوک، کیا بحیثیت مربوب، ساری سمتیں یکساں اور ہم مرتبہ ہیں، کسی میں کوئی جلوۂ تقدیس، کوئی شائبہ الوہیت موجود نہیں، جس طرف بھی نظر پھیرو گے اللہ ہی کے انوار نظر آئیں گے۔

اُس خدائے واحد کی ذات ہر مکان، ہر ظرف کی محدودیت سے پاک اور ہر سمت و جہت سے منزّہ ہے، اس کی تجلیات ہر رُخ پر یکساں پاؤ گے۔ البتہ جو اُمت اب آفاقی

اور عالمگیر پیدا کی جارہی ہے، اس میں مرکزیت اور یک جہتی کی خاطر کوئی قبلہ نما بنا دیا جائے گا۔ وہ ذاتِ لامحدود بے پایاں تو خود ہی ہر ظرف، ہر مکان کو اپنے اندر لئے ہوئے، گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی سمائی بھلا کس ظرف و مکان میں ہو سکتی ہے؟ ہاں! وہ لامکان اور ماوراء الفطرت اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے اس موحد اُمت کے لئے دعا و عبادت کی غرض سے جو بھی قبلہ، جو بھی نقطۂ مرکزیت چاہے مقرر کر دے۔ اس میں دخل کسی سمت کی ذاتی قدوسیت کو ذرا بھی نہیں۔

زمین استقبال کعبہ کے لئے قرآن نے اس آیت میں تیار کر دی۔ کعبہ رخی اور مسائل متعلقہ پر معروضات آگے سنئے گا۔

۹

مابعد جو آیت آتی ہے اُس میں ذکرِ مسیحی شرکِ عیسیٰ ابن مسیح کی فرزندیٔ رب کا ہے۔ الفاظ یہ ہیں :-

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ (آیت ۱۱۶، رکوع ۱۴)

"اور نصرانیوں نے کہا کہ اللہ نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ پاک ہے وہ! اصل یہ ہے کہ اس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اُسی کے فرمانبردار ہیں"۔

یہ کیسی صریح حماقت ہے کہ اللہ سے اس کی کسی بھی مخلوق کا رشتہ ابنیت یا تبنیت کا قائم کیا جائے۔ سب اس کی مشیت تقدیری و تکوینی کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔ آیت میں جو لفظ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ہے، اس کا ترجمہ یہ کہ اللہ نے اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ اس کے بیٹا ہے نہیں، بلکہ بیٹا بنا لیا ہے یا عوامی محاورہ میں "گود لے لیا ہے"۔ عرب کے ایک اُمی کے سنائے اور چلائے ہوئے لفظ خیال میں رکھئے، اور پھر ایک سرسری نظر مسیحی غلطی پر

کا مرتبہ کیا ہوتی، وہ تاریخ مسیحیت پر گر لیجیے۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک بڑا فرقہ ان میں ملتا ہے ADOPTIONISTS اتخاذیین کے نام سے۔ اس کا مرکزی عقیدہ یہ نہیں کہ مسیح خدا کا جنا ہوا، پیدائشی بیٹا ہے، بلکہ گویا خدا نے کامل و مکمل انسان کو اپنا متبنٰی کرلیا ہے۔ اور اسی عقیدہ کی شرح یہ ہے کہ مسیح نہ خلقۃً خدا ہیں نہ وہ شروع سے بنے بنائے ترشے ترشائے، خدا پیدا ہوئے۔ وہ اصلاً بشر ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالث یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع سے پڑنے لگا اور ان سے وہ قدوسیت کے ایسے اوج کمال پر پہنچ گئے کہ اقنوم اول، خدائے برتر و اعظم نے انھیں اپنی ابنیت میں لے لیا اور شریک الوہیت کرلیا۔ اور اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ سارے صفات الٰہی میں شریک و سہیم ہیں۔ آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اس عقیدہ کو الحاد و زندقہ قرار دیا۔ اور بارھویں صدی عیسوی میں اس فرقہ نے پھر زور پکڑا —— ہمارے مسلمان مفسرین اور خادمانِ قرآن سے اگر کہیں کوئی چوک مطالعۂ مسیحیت کے دقائق میں رہ گئی ہو تو اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور؟ آخر وہ قرآن کی ہمہ دانی، ہمہ گیری کہاں سے لاتے؟

۱۰

تاریخ بنی اسرائیل کے اہم عنوانات گنا کر سولھویں رکوع کے شروع میں پھر وہی مضمون دہرایا ہے، جو اسی تاریخ کے سلسلہ میں چھٹے رکوع میں ارشاد ہوا تھا۔

یٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ (آیت ۱۱۷، رکوع ۱۵)

اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمتیں جو میں نے تمھیں بخشی تھیں اور یہ کہ میں نے تمھیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔

گویا یہاں خاتمہ پر دو باتوں کی طرف اشارہ کردیا۔

ایک یہ کہ جب تک نسلی و قومی نبوتوں اور رسالتوں کا دستور قائم رہا، سب سے برگزیدہ اور مقبول قوم اسرائیل ہی کی رہی۔ کسی دوسری قوم کو بہ حیثیت قوم موحد ہونے کا شرف حاصل نہ تھا۔

دوسری بات یہ کہ خدائی مہربانی کوئی ایسی شے نہیں ہوتی، کہ کسی قوم پر بہر حال و بہر صورت چپکی رہے، یہ مشروط ہوتی ہے۔ بندے جب تک ادائے شکر کرتے رہتے ہیں، نعمتیں اور انعام اُن پر قائم رہتے ہیں، لیکن جب اس کے بجائے ناشکری اور نافرمانی مسلسل ہونے لگتی ہے اور اپنے ہی پیمبروں سے سرکشی و بغاوت حد سے بڑھ جاتی ہے، تو بالآخر وہ نعمتیں سلب بھی ہو جاتی ہیں اور وہ انعام پائے ہوئے اب محروم رہ جاتے ہیں۔

یہ گہری اور مستقل حقیقتیں ہیں ہر موقع پر کام آنے والی۔

۱۱

اس کے بعد ذکر حضرت ابراہیمؑ کا شروع ہوتا ہے اور اس ذکر کے بعد کہ آپ کا امتحان بعض چیزوں میں لیا گیا اور آپ جب خدائی امتحان میں پورے اُترے تو آپ کو انعام یہ ملا کہ دنیا کی امامت آپ کے سپرد کی گئی۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ (رکوع ۱۵۔ آیت ۱۹)

"اللہ نے فرمایا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں"

اور امامت سے مراد اصطلاح قرآنی میں، سلطنت و حکومت، جاہ و مال نہیں بلکہ دینی و روحانی پیشوائی ہے۔ اور توریت میں بھی یہ وعدۂ انعامِ الٰہی دُہرایا گیا ہے گو قرآن کا جامع و بلیغ لفظ "امام" اُس میں موجود نہیں۔ صحیفۂ پیدائش میں ہے:-

"اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا، اور تو ایک برکت ہوگا، اور ان کو جو تجھے برکت دیں برکت دوں گا،

اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کر دوں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے"۔ (باب ۱۲، آیت ۱ و ۲)

یہ وہی امامت ہے جو آج تک ابراہیمؑ کے حصہ میں چلی آ رہی ہے، اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں، یعنی یہودیت اور نصرانیت، وہ آپ کی امامت مسلّم رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک نامور فرنگی فاضل آپؑ کا تعارف انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں، بیسویں صدی عیسوی کے ثلث کے خاتمہ پر یوں کرتا ہے:۔

"ابراہیمؑ کی ہستی کسی یہودی سردار کی نہ تھی، جو لوٹ مار کرتے یا ملک گیری کرتے رہتے۔ ان کی اصل اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے۔ وہ حقیقتاً مورثِ اعلیٰ کسی نسل کے نہیں بلکہ بانی و امام مذہبی تحریک کے تھے۔ محمدؐ کی طرح جو اُن کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔ وہ ساری قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت اور قومیت کے حسب روایت اسرائیلی مذہب کے بانی تھے" (طبع چہاردہم، جلد اول صفحہ ۶۰)

جن لفظوں کو میں نے اس مجلس میں زور دے کر پڑھا ہے، انھیں ایک بار پھر سُن لیجئے:۔ "محمدؐ کی طرح وہ بھی قوموں اور قبیلوں کے رہنما تھے"۔ اللہ کے خلیل اور اللہ کے حبیبؐ کے درمیان یہ مماثلت کا اعتراف، یورپ کی زبان سے، بس اللہ ہی کی شان ہے!

ابراہیم خلیل باوجود مرتبۂ خُلّت، بہر حال انسانی دل و جگر اور بشری جذبات رکھتے تھے، یہ عزّہ عظیم پا، باغ باغ ہو گئے، اور فرطِ مسرّت سے وہ جھٹ سے بول اُٹھے وَمِن ذُرِّيَّتِي؟ اور میری نسل بھی اس امامت میں حصہ دار ہو گی نہ؟ ذُرّیت کے معنی اولاد ہی نہیں، بلکہ اولاد در اولاد بھی۔ گویا اس میں آپ کا سارا سلسلۂ نسل آ گیا، شاخِ اسرائیلی، شاخِ اسمٰعیلی دونوں کو شامل۔ اور قرآن نے اسرائیلیوں کے اس دعوی کی جڑ ہی کاٹ دی کہ ابراہیمؑ سے جو وعدے ہوئے، وہ انھیں کی شاخِ اسرائیلی کے ساتھ مخصوص محدود تھے!

ضمناً روشنی اس پر بھی پڑ گئی کہ وعدۂ انعام و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کر لینے کی تمنا نہ صرف امر طبعی ہے، بلکہ سنتِ انبیاء بھی!

بہر حال آپ کی دعا کا جواب، قرآن کے بلیغ ایجاز میں یہ ملا کہ:

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ (آیت ۱۲۴) "میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا"

یعنی فضل و برکت کا سلسلہ تمہاری نسل میں ضرور جاری رہے گا، لیکن اس کے تحقق کے لئے محض ارث نسل و نسب کافی نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح بھی ضروری ہیں۔

الظّٰلِمِیْن کے لفظ کا خوب خیال رکھیے، کافر تو اس میں کھلے ہوئے داخل ہیں لیکن اہلِ علم کے ایک گروہ نے اس سے مراد فاسق بھی لئے ہیں۔ اور مرشد تھانوئ نے اس سے یہ استنباط تو بہت ہی خوب کیا ہے کہ "اختیاری بدعملی کے ساتھ فضلِ خداوندی اور انعام الٰہی جمع نہیں ہو سکتے"۔

یہ تماشہ بھی عجیب ہے کہ بائبل کی تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اُکتا کر بعض روشن خیال فرنگیوں نے انیسویں صدی کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کی تاریخیت ہی سے انکار کر دیا اور یہ کہنے لگے کہ یہ شخصی نام نہیں بلکہ اسم جنس تھا، یعنی شیخ قبیلہ کا لقب۔ لیکن کچھ ہی دن بعد پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کا ثلث اول ہی ختم ہو رہا تھا کہ ایک بار پھر ابراہیم خلیلؑ کی تاریخی حیثیت مسلّم ہو گئی۔

۱۲

آیت ۱۱۵، ابھی کچھ ہی دیر پہلے گزر چکی ہے، لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ اب تحویلِ قبلہ کا حکم جب صراحت سے نازل ہونے کو ہے، تو پھر اس طرح کی چہ میگوئیاں اہلِ کتاب، خصوصاً یہود میں شروع ہوئیں، حالانکہ اب تک جو نماز کا قبلہ بیت المقدس بنا ہوا تھا، یہ مبنی کسی قرآنی حکم پر نہ تھا، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء بنی اسرائیل کا یہ قبلہ

اپنا بھی محض اجتہاداً بنالیا تھا، اور اب قیام مکہ ختم ہونے اور ہجرت مدینہ اختیار کرنے پر، کچھ زمانہ کے بعد قبلہ نصِ قرآنی سے مقرر ہونے کو تھا کہ اس پر قیل وقال شروع ہو گئی اور قرآن کے بیان سے معلوم ہوا کہ زبانیں کس طرح چلنا شروع ہوئیں:۔

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ○ (رکوع ۱۰، آیت ۱۴۲)

"یہ بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو اُن کے اس قبلہ سے ہٹا دیا ہے جس پر وہ اب تک تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق و مغرب دونوں اللہ ہی کی ملک ہیں اور وہ جسے چاہتا ہے چلاتا ہے سیدھی راہ پر"۔

کٹھ حجتے اور نافہم لوگ پھر وہی قضیہ سمت کا نکال رہے ہیں، اور بحث مشرق اور مغرب کی شروع کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسی سمت سے اور نئے پُرانے قبلہ سے کیا ہوتا ہے حکیم مطلق جن مصلحتوں اور حکمتوں سے بھی چاہے جس مکان کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے وہی سیدھی راہ کا اتباع ہوگا، اس کے کام میں چون وچرا تو وہی لوگ کریں گے جو سقیم ہوں گے جو عقل کے کورے، فہم کے ناقص۔ افسوس ہے کہ مفسرین خود سمت وجہت کی بحث میں پڑ گئے قرآن نے اصل اعتراض ہی پر تو اعتراض کیا تھا اور اس بحث ہی کو سرے سے باطل ٹھہرایا تھا۔

۱۳

اور معاً بعد جو حکم نماز کے وقت رُخ کرنے کا ملتا ہے وہ کسی جہت یا سمت کی جانب نہیں بلکہ ایک مخصوص مکان اور متعین عمارت کی بابت ملتا ہے۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ (آیت ۱۴۴)

آپ اپنا منہ پھیر لیا کیجئے مسجد حرام کی طرف۔

اور معلوم و معروف ہے کہ مسجد الحرام نام ہے مسجد حرم شریف یا خانۂ کعبہ والی مسجد کا
ایک معروف و متعین عمارت کا۔ اور قرآن نے یہ حکم صادر کر کے یہ بھی جتا دیا کہ یہ منکرین
اہلِ کتاب اس حکم تحویل قبلہ کی طرف سے کسی اشتباہ و مغالطہ میں نہ رہیں اور انھیں بتا دیا
گیا تھا کہ قبلۂ ابراہیمی اس اُمت کا بھی قبلہ ہوگا۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (آیت ۱۴۴)

"اور یہ لوگ کتاب پا چکے ہیں وہ یقیناً اسے بھی خوب جانتے ہیں کہ یہ حکم بھی ان کے
پروردگار ہی کی طرف سے ہے"۔

اور یہ لوگ ایک اسی حکم کو کیا، ہمارے ان رسول کو بھی خوب ہی پہچانتے ہیں۔ ایسے ہی جیسے
خود اپنی قوم والوں کو خوب پہچانتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (آیت ۱۴۶)

"اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ ان کو ایسا ہی پہچانتے ہیں جیسے
اپنے نسل والوں کو۔

یعرفونہ میں ضمیرہٗ سے کیا مراد ہے؟ اگرچہ اگلوں میں اکثر نے اس سے مراد یہی حکم
تحویل قبلہ لیا ہے یعنی اہل کتاب مسجد حرام کو بھی بہ حیثیت قبلۃ الانبیاء کے خوب جانتے ہیں،
لیکن بعد کو اکثر اہلِ تفسیر کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ اشارہ ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے
اور آنحضورؐ کی اتنی علامتیں ان کے ہاں منقول ہیں کہ اب انھیں اس بارے میں کوئی اشتباہ
نہیں رہ سکتا، اہم ترین لفظ آیت میں اَبْنَآءَهُمْ لفظی معنی اپنے لڑکوں کے ہیں لیکن
اَبْنَآءَهُمْ صیغۂ جمع سے مراد فرداً فرداً نہیں، بلکہ قوم اسرائیل، نسل اسرائیل ہے اور
یہ لوگ آپ کو بھی اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے کہ اسرائیلی پیمبروں کو۔
تعصب کو کام میں لائیں تو بات دوسری ہے

درمیان کی بہت سی آیتوں کو طے کرتی ہوئی، آخری نظر اس آیت پر جا کر رُکتی ہے، بلکہ رُک جاتی ہے۔ پوری آیت ذرا بڑی ہے۔ غرض مقصود کے لئے نصف آیت بالکل کافی ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ (آیت ۱۷۷)

"طاعت یہ نہیں کہ تم اپنا منھ مشرق یا مغرب کی طرف کر لو بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) اور پیمبروں پر اور اس کی محبت میں مال تقسیم کرے قرابت داروں اور یتیموں پر اور سائلوں پر اور راہ گیروں پر۔"

آیت قرآن مجید کی مشکل ترین آیتوں میں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں اصلاً بیان صرف دو چیزوں کا ہے، ایک اس کا کہ بِر یا طاعت یا نیکی کیا نہیں، اور ایک اس کا کہ بِر یا طاعت یا نیکی کیا ہے۔ اس دوسرے سوال کا جواب بہت لمبا ہے۔ فلاں فلاں عقیدے اور فلاں فلاں اعمال طاعت کے ضروری اجزاء ہیں۔ طاعت کے جو ضروری اجزاء ہیں ان میں اختلاف کسی کو نہیں۔ اللہ، قیامت، انبیاء وغیرہ پر اعتقاد ہونا چاہیے۔ مالی امداد عزیزوں، یتیموں، فقیروں وغیرہ سب کی کرنا چاہیے۔ گفتگو صرف اس میں رہ جاتی ہے کہ قرآن نے یہاں طاعت کے دائرہ سے باہر کس عمل کو رکھا ہے؟ یہاں کس عمل کا نام لے کر قرآن نے اس کے طاعت ہونے سے سرے سے انکار کیا ہے؟ وہ ہے مشرق یا مغرب کی

طرف رُخ کرنا"۔ اور مشرق رُخی یا مغرب رُخی کسی قسم کی بھی طاعت یا عبادت نہیں۔ اس استقبالِ قبلہ میں بھی چونکہ کسی نہ کسی طرف رُخ کرنا ہی پڑتا ہے، اس لیے مفسرین کو اُلجھن یہ پیش آ گئی ہے کہ اس سے تو استقبال کا حکم ہی رد ہوا جاتا ہے۔ حالانکہ آیت سے بیت الکعبہ کی طرف رُخ کرنے کی ممانعت کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ نماز میں تو رُخ ایک متعین و معروف مکان۔ بیت الکعبہ کی طرف رہے، اور اب وہ مکان دنیا کے کسی خطّے سے جس سمت میں بھی اور جب رُخ پر بھی پڑ جائے۔ حکم میں سمت کی تو سرے سے تعیین ہی نہیں۔ نہ جنوب کی، نہ شمال کی، نہ مشرق کی، نہ مغرب کی۔ اب اتفاق سے چونکہ وہ عمارت نمازی کے کسی نہ کسی سمت میں لامحالہ پڑے گی، اس لئے سمت کا تصور خود اس حکم کے ساتھ وابستہ ہو گیا، اور اس نے قلبِ مومن میں اُلجھن پیدا کر دی۔ اصل میں حکم کی زد مشرک قوموں پر پڑتی ہے جن کے ہاں شرک کی بیسیوں قسموں، آفتاب پرستی، ستارہ پرستی، بُت پرستی وغیرہ کے ساتھ ایک خاص قسم سمت پرستی کی تھی، اور کچھ مشرک قومیں طلوعِ آفتاب کی بناء پر مقدس سمت مشرق کو سمجھنے لگیں تھیں۔ اور کچھ قومیں غروبِ آفتاب کی مناسبت سے سمت مغرب کو! قرآن کو یہاں مخالفت و ممانعت محض اس جہت پرستی یا سمت پرستی کی کرنا تھی! آیت اس خطبہ میں اصلاً صرف اس کے پہلے ٹکڑے لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کی خاطر پیش کی گئی، لیکن ضمناً یہ بات بھی سن لینے کی ہے کہ آیت قرآن کی اہم ترین و محکم ترین آیتوں میں سے ہے۔ اور حدیث ہی میں تو یہ صراحت اور بشارت موجود ہے کہ

من عمل بھذہ الآیۃ فقد استکمل۔

جس نے اس آیت پر عمل کر لیا، اس نے اپنے ایمان کی تکمیل کر لی۔

اور مفسر قرطبی نے لکھا ہے:۔

وقال علماءنا ھذہ آیۃ عظیمۃ من اُمّھات احکام القرآن

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ یہ احکام قرآن کی کلیدی آیتوں میں سے ہے

اور آگے اس سے سولہ مسئلے عقائد و طاعات کے نکال کر گنائے ہیں۔ صوفیۂ محققین نے بھی آیت کو شریعت و طریقت کا جامع بتایا ہے اور ایک پُر لطف بات یہ بھی ہے کہ پادری ویری (WHERRY) صاحب جنھوں نے سیل کے انگریزی ترجمۂ قرآن کو زمین بنا کر اس پر چار جلدیں اپنی تفسیر کی لکھ ڈالی ہیں، ان کے قلم سے قدرت یہ عبارت لکھواتی ہے

" یہ آیت قرآن کی بلند ترین آیتوں میں سے ہے ... . ذات باری پر ایمان نوع انسان کے ساتھ سلوک، اس کو اس میں واضح طور پر مذہب کا جوہر اصلی بتایا ہے اس میں لُب لُباب عقائد اور اعمال کا آگیا ہے۔"

غنیمت اور بہت غنیمت ہے کہ پادری صاحب موصوف کو قرآن مجید میں کچھ آیتیں تو بہت بلند قسم کی نظر آگئیں۔

۱۵

اس کے معاً بعد حکم قصاص کا شروع ہو جاتا ہے اور آیت قصاص کی آجاتی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (آیت ۱۷۸)

" اے ایمان والو تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔"

اس میں سرسری طور پر پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ اس حکم کے مخاطب کلمہ گو امت کے افراد نہیں کہ جس کسی کو کسی سے کوئی شکایت پیدا ہوئی، بس اُس نے اس کی مار کاٹ اندھا دھند شروع کر دی۔ حکم امت کے اہل حل و عقد کو مل رہا ہے۔ حکم انھیں مل رہا ہے جو ایک اجتماعی وجود اور طاقت رکھتے ہیں اور اپنی حکومت کے قانون پر نفاذ کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح سمجھنے کا دوسرا لفظ قصاص ہے۔ "قصاص" انتقام محض کے مرادف نہیں، بلکہ قانون فوجداری کے ماتحت انتقام کی ایک منظم و مہذب شکل کا نام ہے، اور اُمت کا ایک قانونی و اجتماعی حق ہے۔ اس کے نفاذ کی ذمہ داری عدالت پر عائد ہوتی ہے۔

اسلامی قصاص کا جزو اہم یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ رہے گی اور خون خون

سب کا برابر رہے گا۔ یہ نہیں کہ اونچے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ سمجھی جائے۔ ایک مقتول کے قصاص میں دوسری قوم یا پورے قبیلہ کو تباہ کر دیا جائے۔ عرب جاہلی میں ایک دستور یہ بھی پڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالتا تو قصاص میں جان اس آزاد کی لینے کے بجائے کسی غلام کی لی جاتی اور جاہلی عرب کا ایک دستور یہ بھی ہو گیا تھا کہ اگر قاتل کسی ادنیٰ قبیلہ کا شخص ہوتا تو کسی اعلیٰ قبیلہ کے ایک مقتول کے عوض قصاص اس ادنیٰ قبیلہ کے دو شخصوں سے لیا جاتا۔ اور دنیا کی تاریخ آج بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ امریکہ میں آج بھی ایک گورے (WHITE) کا خون ایک کالے (NEGRO) کے خون سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اور فرنگی حکومتیں، ابھی چند ہی سال کی بات ہے کہ اپنے ایک مقتول کے عوض کالی قوم والے قاتل کے متعدد ہم قوموں کی جانیں لئے بغیر تسکین حاصل نہیں کرتی تھیں۔

یہاں پہنچ کر فقہائے مفسرین کے اس نکتہ سنجی کی داد دیجئے کہ انھوں نے قصاص کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے کہ:۔

اى المساواة بينهما لا الزيادة۔

قصاص سے مراد یہ ہے کہ بس اتنا ہی لیا جائے گا زیادہ نہیں۔

اور نسفی صاحبِ مدارک التنزیل کے الفاظ میں:

القصاص عبارة من المساوات والمعنى فرض عليكم اعتبار المماثلة والمساواة من القتلى

قصاص سے مراد مساوات ہے، اور مطلب کہنے کا یہ ہے کہ قتل کے بارے مماثلت و مساوات ہی کو دیکھا جائے گا۔"

۱۶

قتل و قصاص کے سلسلہ میں ایک نیا لفظ قرآن کی زبان سے دیت کا سن لیجئے

یا اُردو میں خوں بہا۔

نیا اس معنی میں کہ دنیا کے اکثر مہذب قانونوں میں اس کا مرادف نہ ملے گا، رومیوں کے قانون میں قتل ایک فوجداری کا جرم تھا، دیوانی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور فرنگی قانون چونکہ اسی رومی قانون کا نقشِ ثانی ہے اس میں بھی جُرمِ قتل صرف فوجداری کا جرم ہے لیکن اسلام چونکہ عین دینِ فطرت ہے۔ اس نے قتل کو ایک حد تک دیوانی کا جرم بھی تسلیم کیا ہے، اور اس نے یہ حقیقت سامنے رکھی ہے کہ قتل جس طرح اسٹیٹ یا حکومت اور سوسائٹی یا معاشرہ کے ایک قانون کی خلاف ورزی ہے، اسی طرح یہ بھرپور حملہ اس کی شخصی حیثیت پر بھی ہے گویا یہ جرم دوگونہ حیثیت رکھتا ہے۔ ایک پبلک یا عمومی۔ دوسرے نجی یا انفرادی اسی لئے مقتول کے وارثوں یا خون کے عزیزوں کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ چاہیں تو قاتل کو پوری سزا حکومت سے دلائیں۔ اور اگر چاہیں تو خود مالی معاوضہ لے کر انتہائی سزا سے دست بردار ہو جائیں۔ بس اسی کو اصطلاحِ شریعت میں دِیت کہتے ہیں۔

DAMAGES کا انگریزی لفظ آپ نے سُنا ہوگا۔ جب کسی ملک کی رعایا کا خون دوسرے ملک میں ہو جاتا ہے اور اجنبی ملک میں فوجداری کا مقدمہ چلانے میں دشواریاں اور زحمتیں محسوس ہوتی ہیں، تو جائز ہے کہ بجائے فوجداری استغاثہ اور اس کی پیروی کے صرف ہرجانہ کی مالی رقم پر کفایت کر لی جائے Damages اسی ہرجانہ کو کہتے ہیں، اور ایک حد تک یہ مثل خوں بہا کے ہے Damages کا لفظ آپ نے صاحب کی زبان سے سُنا ہے، آپ کو مانوس معلوم ہوتا ہے، دیت یا خوں بہا آپ صرف مولوں مُلانوں کی کتابوں میں پڑھتے ہیں، اس لئے قدرتاً آپ کو نامانوس معلوم ہوتا ہے۔

۱۷

آگے قاتل و مقتول دونوں کے فریقوں کو خوب تاکید ہے، عدل و رفع شر اور ظلم

اور زیادتی سے بچنے کی۔ ایک فریق پر اس کی کہ وہ خوں بہا کا مطالبہ معقولیت کے حدود کے اندر رہ کر کرے، آدمیت سے کرے، غصہ اور اشتعال سے بات کو بتنگڑ نہ بنائے اور معاملہ کو اور آگے نہ بڑھائے اور دوسری طرف قاتل کے یا ملزموں کے فریق کے دل میں یہ بات اُبھاری ہے کہ جتنی رقم کی قرار داد ہو چکی ہے، اسے بغیر کسی طوالت یا پیچیدگی اور بدمزگی کے خوش اسلوبی کے ساتھ پہنچا دیں۔ اور دونوں فریق اُمت یا معاشرہ کو فسادِ مزید سے ہر طرح بچائے رکھیں ـــــ اور مضمون کو ختم ان دو آیتوں پر کیا ہے:

ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (آیات ۱۷۸ - ۱۷۹)

"یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے اور تمہارے لئے (قانون) قصاص میں زندگی ہے، تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ"۔

اتنی نفسیاتی نزاکتوں کا پاس رکھنا، اور ہر فریق کو نفسانیت کے اثر سے بچائے رکھنا، یہ شان صرف خدائی ہی قانون کی ہو سکتی ہے، اور اسی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ایک طرف قصاص کی بظاہر سختی، اور دوسری طرف دیت و عفو کی نرمی، یہ حُسنِ امتزاج اور اعتدال۔ توازن کا مکمل ترام وہی قانون ہو سکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں بلکہ حکمت مطلق سے نکلا ہے ـــــ اور جو لوگ اس قسم کی زیادتیوں پر آمادہ رہتے ہوں، کہ کسی پر جھوٹا دعوئے قتل کا دائر کر دیا، یا کسی قاتل کو پہلے تو بالکل معاف کر دیا اور پھر معافی کے بعد درپے پورے قصاص کے ہو گئے۔ ایسے بے انصافوں اور خدانا ترسوں کو روکنے والا عذاب الیم یا خوف آخرت ہی ہو سکتا ہے ـــــ اور یہ ساری ہدایتیں، ترغیبیں ہیں ہی، اسی لئے کہ سارا معاشرہ پرہیزگاروں، منصف مزاجوں

عدل شعاروں کی قوم بن جائے، بلکہ امت کا مزاج ہی عدل و تقویٰ پر قائم ہو جائے۔

(۱۸)

روزمرہ کے احکام قرآن میں متفرق و متعدد مقامات میں نہیں ملتے۔ جو بھی حکم ملا ہے، مختصر جامعیت کے ساتھ ایک ہی مقام ہے اور ذہن رکھنے کے قابل ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ (آیت ۱۸۳-۱۸۴)

"اے مسلمانو تمہارے اوپر روزہ فرض کیا گیا ہے، جیسا کہ تم سے پیشتر کے لوگوں پر فرض ہو چکا ہے، یہ روزے گنتی کے چند روز ہیں۔"

روزے کے حکم سے طبعی وحشت دور کرنے کے لئے پہلے تو یہی فرمایا گیا ہے، کہ یہ تمہارے لئے کوئی انوکھا حکم، کوئی نئی سختی نہیں، یہ حکم تو پہلی قوموں کو بھی مل چکا ہے۔ لیکن یہ مماثلت صرف فرضیت کے لحاظ سے ہے، تعداد، زمانہ، مقصد و غایت وغیرہ کے لحاظ سے نہیں۔ روزے قمری جنتری کے نویں مہینہ میں ہوتے ہیں، جسے ماہ رمضان کہا جاتا ہے اور ہر ہلالی مہینہ کی طرح یہ مہینہ بھی گھوم پھر کر سال کے ہر موسم میں آتا رہتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں روزہ نام ہے طلوعِ فجر سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور عملِ زوجیت سے بچے رہنے کا۔ اور حدیث میں سخت تاکید غیبت، فحش، جھوٹ، بدزبانی، دل آزاری وغیرہ ہر قسم کے گناہ سے بچنے کی آئی ہے۔ دنیا کی طبیں اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کو دور کرنے والا اور علاج جسمانی کا ایک بہترین نسخہ ہے اور اصلاحِ نفس و تزکیۂ روح میں جو اس سے مدد ملتی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ پھر اس سے سپاہیانہ برداشت اور ضبطِ نفس کی تربیت جو تازہ ہو جاتی ہے اس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین پروگرام ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ، ایک عجیب جامعیت کا دو لفظی ننھا سا فقرہ ہے، جس کے اندر ساری ظاہری اور باطنی، اور انفرادی اور اجتماعی فضیلتیں آگئیں۔ گویا مقصود صرف حصولِ تقویٰ ہے۔ تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جس طرح مضر غذاؤں اور مضر عادتوں سے محتاط رہنے سے جسمانی صحت درست ہوجاتی ہے، بھوک کھل جاتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے، مادی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہوجاتی ہے، اسی طرح اِس عالمِ آب و گِل میں تقویٰ اختیار کئے رہنے سے آخرت کی نعمتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت انسان میں پوری طرح پیدا ہوکر رہتی ہے۔

اور معاً بعد ہے اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، کم ہمتوں کی ڈھارس بندھانے کو یہ کہ کوئی بڑا طویل زمانہ اس کے لئے نہیں۔ دو تین مہینہ کی مسلسل مدت بھی اس کے لئے ضروری نہیں۔ کل ایک مہینہ کی مدت۔ اور پھر اس میں بھی بکثرت رعایتیں۔ وقتی طور پر بیمار مستثنیٰ، مسافر مستثنیٰ، دیرینہ سال مستثنیٰ، اور ان میں سے کوئی معذوری مستقل تو استثناء بھی مستقل۔ وحدت امت کی حکمت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ زمانہ ایک ہی متعین ہو۔ چنانچہ زمانہ متعین اور روزے کے شرائط بھی متعین۔

اور ایک بڑی رعایت فدیہ دینے کی ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کے ماتحت۔ اطاقت کی پوری بحث یہاں دہرایئے تو خاصی طوالت کی نوبت آجائے۔ مختصر یہ کہ عربی میں وسعت اور طاقت دونوں کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ وسعت کے معنی تو گنجائش و امکان کے ہیں۔ کسی کام کو بسہولت انجام دے دینے کے ہیں۔ اور طاقت یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کو کر ڈالے لیکن مشقت کے بعد، یا جان ہلکان کرکے ہی کرسکے۔ جن حضرات کو ذرا تفصیل سے اس بحث کے دیکھنے کا شوق ہو، وہ خاکسار کی تفسیر میں اس مقام کو ملاحظہ فرمائیں۔

اس سلسلہ کی آیتوں میں خصوصی اہمیت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں:

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ (آیت ۱۸۵)

"سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے تو چاہیئے کہ وہ مہینہ بھر روزے رکھے۔"

اہم ترین لفظ "شہود شہر" کا ہے، یعنی مہینہ کے پالینے کا۔ یعنی فرضیت روزہ کی اس کے لئے ہے جو ماہ رمضان کا شہود کرے۔ اس مہینہ کو پائے لیکن اگر کوئی ملک ایسا ہو جہاں چاند شروع مہینہ میں طلوع ہی نہ ہوتا ہو، وہاں فرضیت کا حکم ہی نہیں باقی رہے گا یہ اور بات ہے کہ وہاں بھی تاریخوں کا حساب کر کے رمضان ادا کر لے۔ جیسے اُن ملکوں میں جہاں سورج طلوع ہی نہیں ہوتا، یا برائے نام طلوع ہوتا ہے، نماز بھی گھڑی سے حساب لگا کر کسی طرح پڑھی جائے گی۔ آیت کے اندر ایسے الفاظ لے آنا جس سے استدلال ایسے نادر الوجود ملکوں کے وجود پر ہو سکے، اعجاز قرآنی نہیں تو اور کیا ہے؟

ابوبکر جصاص رازی، قدیم فقہائے حنفیہ میں مرتبۂ امامت رکھتے ہیں اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں آیت میں مذکور و مندرج احکام کا ذکر کرتے ہیں، وہاں نمبر اوّل پر اسی شہود شہر کو بنیاد فرضیت قرار دیتے ہیں:۔

فیہ عدۃ احکام منہا ایجاب الصیام علی من شہد لا علی من لم یشہد۔

"اس میں متعدد احکام ہیں، ان میں روزے کا وجوب ان کے لئے جنھوں نے مہینہ کو پایا، نہ کہ ان کے لئے جنھوں نے مہینہ کو نہیں پایا

کتنے شبہات کا جواب اس ایک لفظ "شہود شہر" سے نکل آیا!

﴿ ۱۹ ﴾

بلاغت قرآنی کا ایک عام اسلوب یہ بھی ہے کہ جزئیات احکام بیان کرتے کرتے، بہ ظاہر محض برسبیل تذکرہ یا اتفاقیہ کوئی عام قاعدہ یا اصولی نکتہ بیان کر دیا جاتا ہے جس کے اندر کوئی گُہر امغز ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ صوم وصیام کے مسائل و احکام بیان کرتے کرتے بیچ میں یہ ٹکڑا بھی لے آتا ہے:

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ ۔ (آیت ۱۸۵)

"(ان تمام انتظامات سے) اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا۔"

یعنی یہ ساری رعایتیں اور سہولتیں جو بیان ہوئیں اس سے مقصود اللہ کو بندہ کے حق میں آسانیاں ہی فراہم کرنا ہے نہ کہ سختیاں اور دشواریاں۔ چنانچہ جو روزے قضا ہو جائیں، ان کی تکمیل اگر کر لو تو روزوں کی ادائی کا اجر پورا مل جائے گا، اور گھاٹا کچھ نہیں اٹھانا پڑے گا ـــــــ اور ایک صوم وصیام پر کیا موقوف ہے۔ ہر حکم کی تہہ میں بندوں کے حق میں مصلحتیں اور رحمتیں ہی ملیں گی اور جہاں کوئی بھی دشواری یا معذوری پیش آئی، بس اس کے مناسب ومتناسب کوئی نہ کوئی رخصت یا رعایت بھی مل گئی۔

اور مسائل رمضان ومتعلقات رمضان کا ابھی تکملہ ہی ہو رہا ہے کہ یہ آیت نظر پڑ جاتی ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (آیت ۱۸۵)

(اور اے پیمبر) "آپ سے میرے بندے جب میرے باب میں سوال کریں، آپ کہہ دیجئے کہ میں نزدیک ہی ہوں، پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے تو بندوں کو چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت یاب ہوں"۔

بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعا کے متعلق سوال یہ ایک الگ سے بات کہاں سے آگئی، لیکن ذرا غور کیجیے تو صاف سمجھ میں آ جائے گا کہ ربط میں جو چلا اس روزہ داری اور

شب بیداری سے پیدا ہوتی ہے، اُس کا عین تقاضا ہے کہ تعلق باللہ کی روح بیدار ہو، اور طبیعت میں اللہ سے مانگنے، سوال کرنے اور اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانے، گڑگڑانے کی ہوا سر پر سوار ہو۔ رمضان میں اس تعلق کی طلب اور تڑپ پیدا ہونا تو عین مقتضائے حال کے مطابق ہے۔

پھر ایک اور باریکی ملاحظہ ہو۔ آیت میں خطاب براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ جناب باری سے تعلق کے لئے توسط رسول اللہ ہی کے ساتھ مخصوص رکھنا اور انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف گمان نہ لے جانا ــــ خدا کے ساتھ بندوں کا ربط و تعلق، جو قدیم مذہبوں کے سامنے ایک سخت گتھی ہمیشہ رہا کی ہے اور اکثر مذہبوں نے تو خدا کو اتنا دور اور بندوں سے اتنا بعید فرض کر لیا ہے کہ اس تک رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔ قرآن نے اس وہم کو دُور کر دیا اور صاف صاف بتایا ہے کہ جسے تم دُور سمجھ رہے ہو، وہ دور نہیں، نزدیک ہی ہے، اور اس سے تم ربط ہمیشہ ہی حاصل کر سکتے ہو۔ یہ قریب رہنا تو ہمیشہ ہی ہے اور رمضان میں اس عموم میں خصوص پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ربط خاص سے خاص تر ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچئے، بندوں کے لئے تسلّی، تسکین، راحت کا کتنا سامان اس آیت کے اندر رکھ دیا ہے۔

اپنے خدا کو ڈھونڈھنے کے لئے، اس سے راز و نیاز کرنے کے لئے کہیں اور نہیں جانا ہے، وہ تو ہم سے قریب ہی ہے۔

ایک نکتہ اس آیت کے ذیل میں اور ہے۔ اس ایک آیت کے اندر ضمیر متکلم کتنی بار عَنِّیْ میں، فَاِنِّیْ میں، اُجِیْبُ میں، دَعَانِ میں، لِیْ میں، بِیْ میں صیغۂ واحد میں آتی ہے۔ زبان کے نکتہ سنجوں اور بلاغت کے راز آشناؤں کا قول یہاں پہنچکر پھر یاد کر لیجئے کہ ضمیر جمع متکلم جس طرح دلالت کرتی ہے قدرت، عظمت و قوت پر، اقتدار و حکومت پر، ضمیر واحد متکلم اسی طرح مخصوص ہے التفات، اختصاص اور یگانگت

کے لئے! ——— خوش نصیب بندے! تیرا پروردگار تجھ کو کتنا اپنے قریب کھینچتا جارہا ہے!

آیت کے الفاظ پر نظر ایک بار پھر ہو، اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ: پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں، ہر پکار سنتا ہوں، اس میں کوئی شبہ نہ ہو۔ اور پھر جن دعاؤں کو قابل قبول سمجھتا ہوں انھیں قبول بھی کر لیتا ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ میرے ہاں ہر دعا اندھا دھند قبول ہی ہو جاتی ہے۔ ہاں سن، ہر دعا لی جاتی ہے، معقول یا نامعقول بندہ غریب کو کیا خبر کہ کون اس کے حق میں مفید ہو گی، کون مضر۔ قبول تو بس وہی دعائیں ہوں گی جو رحمت و حکمت مطلقہ کے منافی نہ ہوں گی۔

وَلْيُؤْمِنُوا بِي اور ایمان لائیں مجھ پر۔ ایمان محض میرے اوپر رکھیں، ایمان اگر وہ سرے سے کمیں اور رکھتے تو دعا ہی مجھ سے وہ کیوں کرتے۔ نہیں، بلکہ ایمان لائیں میرے صفات کاملہ پر، میرے حکیم ہونے پر، میرے حاکم ہونے پر، میرے قادر ہونے پر، اور میری رعایت مصالح پر

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ٥ تاکہ ان پر فوز و فلاح کی، ہدایت کی راہیں کھل جائیں، تاکہ فلاح دارین کے دروازے ان پر کھل کر رہیں اور ایمان کامل اور تعمیل احکام الٰہی کے بعد، درجۂ رشد تک پہونچ جانے میں امر مانع بھی کیا ہو سکتا ہے؟

۲۰

جہاد و قتال کا ذکر تو قرآن مجید میں بار بار آیا ہے اور اس کے احکام قرآن کے متفرق حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جگہ اس ضمن میں پارہ سیقول کے نصف اول میں ہے:

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى

التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (آیت ۱۹۵)

"خرچ کرتے رہو اللہ کی راہ میں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیک کام کرتے رہو۔ بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"

جس جنگ کا نام شریعت کی اصطلاح میں جہاد ہے، اور جسے قرآن میں قتال سے تعبیر کیا گیا ہے، وہ ملک گیری کے لئے، سلطانی شان و شوکت کے لئے، عسکری فتح مندی اور نام آوری کے لئے جائز نہیں۔ اس کے لئے سب سے بڑی، سب سے کڑی، سب سے پہلی قید لگی ہوئی ہے فی سبیل اللہ کی، اللہ کی راہ میں ہونے کی۔ جان اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وہ نفس کی راہ میں گنوانے کے لئے نہیں۔ صرف دین کی خدمت میں پیش کر دینے کے لئے ہے۔ اور جان کے بعد ذکر مال کا، نعمت کی حیثیت سے آتا ہے۔ اس کے لئے بھی شرط وہی فی سبیل اللہ کی لگی ہوئی۔ قدر اس صرف مال کی نہیں جو ہوائے نفس کی راہ میں ہو ناحق و باطل کے لئے ہو۔ لیکن اس حکم کے ساتھ یہ دوسرا حکم کیسا جڑا ہوا ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ یعنی یہ منع قتال کی تعلیم کیسی؟

جی نہیں، منع قتال کہاں؟ سیاق سے تو عین تائیدی اور تاکیدی حکم مل رہا ہے۔ کہ جہاد و قتال کا موقع آجانے پر مجاہدوں کی مالی ضرورتوں کی طرف سے غفلت ہرگز نہ برتی جائے، ان کی مالی اعانت میں بخل کر کے امت کو تباہی و ہلاکت میں ہرگز نہ ڈالو۔ دل کھول کر ان کی مدد کرتے رہو، اور اس موقع پر دست کشی کو بالکل ہی خودکشی کے مرادف سمجھو! ——— اور آیت کا بقیہ حصہ اس کی تشریح و تقویت کے لئے ہے۔ التَّهْلُكَةِ کے یہی معنی صحابہؓ سے منقول ہیں۔ صحابیوں میں عبد اللہ ابن عباسؓ، ابو ایوب انصاریؓ اور حذیفہ نے لئے ہیں۔ اور یہی تابعین میں حسن، قتادہ، عکرمہ اور عطاء سے مروی ہیں

تو گویا آیت سے جو پہلو منع جہاد کا بے غوری کی بنا پر نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا، وہ

درحقیقت عین ترغیب و تاکید میں ہے۔ اور آخر آیت میں احسان اور محسنین میں اشارہ جہاد اور مجاہدین ہی سے ہے۔ احسان یعنی حُسنِ عمل اسی مفہوم میں ہے۔

(۲۱)

احکام جہاد وقتال کے بعد ہی مسائل حج شروع ہو جاتے ہیں، اور اس سلسلہ میں عازمان حج سے خطاب کر کے آیا ہے:

وَتَزَوَّدُوْا (آیت ۱۹۷) زاد راہ لے لیا کرو

غیر مذہب والے تعجب نہیں کہ اس حکم کو حیرت سے سنیں اور کہنے لگیں کہ یہ حج کا سفر تو عین عبادتی سفر اور خدا کی راہ کا سفر ہے، اس کے ضمن میں یہ ظاہری سامان پر زور کیسا؟ اس کے لئے تو تدبیر تمام تر اس پر چھوڑ دینا چاہیئے جس کی خاطر سفر کیا جا رہا ہے۔ تیرتھ یاترا کی شان تو یہی ہے۔ اس سفر میں تو ہر اقدام ماسوا سے علیحدگی کا ہونا چاہیئے ——

جی نہیں۔ یہی تو بڑا فرق اسلام اور دوسرے مذہبوں کے درمیان ہے۔ قرآن کے سامنے تو ان ناقص مذہبوں کے نمونے موجود تھے جن کے پیرو تیرتھ یاترا یا زیارت مآثر و مقابر کے لئے نکلتے، تو مفلس و قلاش ہو کر، ننگے اور بھوکے اور مانگتے کھاتے ہوئے اور اپنا بار دوسروں پر ڈالتے ہوئے بدھ مذہب کے بھکشو تو خصوصاً اس لت میں مبتلا تھے اور عرب جاہلی کنگال بن کر زیارت کو قابل فخر سمجھتے، حدیث بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس صحابی کی روایت ہے:

كان اهل اليمن يحجون ولا يتزودون ويقولون نحن المتوكلون فاذا قدموا بمكة سألوا الناس.

"یمن والے حج کرتے جاتے تو زاد راہ نہ لیتے بلکہ یہ کہتے رہتے کہ ہم تو متوکل ہیں، اور جب مکہ پہنچتے تو لوگوں سے مانگتے رہتے۔"

اور تفسیر ابن جریر میں ہے:

کانوا یحجون بغیر زاد کان بعضہم اذا احرم رمی ما معہ من الزاد

"لوگ حج تو کرتے مگر بغیر زاد لئے ہوئے اور کوئی تو ایسا بھی ہوتا جو احرام پہن لینے کے بعد زاد کو پھینک دیتا۔"

اور تفسیر قرطبی میں ہے:

من العرب کانت تجیئ الی الحج بلا زاد ویقول بعضہم کیف نحج بیت اللہ ولا یطعمنا

عربوں میں سے بعض حج کو آتے بلا کسی توشہ راہ کے اور بعض ان میں سے کہتے ہم اللہ کے گھر کا حج کس طرح کریں تا آنکہ وہ ہمیں نہ کھلائے۔

تو قرآن کو اس جھوٹے توکل، اس نمائشی روحانیت سے روکنا اور ہر حاجی و زائر میں شخصی غیرت و خودداری پیدا کرنا تھا اور دوسری طرف اجتماعی معاشیات کو ایک خواہ مخواہ کے بار سے روکنا تھا اور ایک تمام غلط رسم و رواج سے نجات دلانا۔ اس لئے تاکیدًا ارشاد ہوا ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی ز وَاتَّقُوْنِ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ ○ (آیت ۱۹۷)

"اور زادِ راہ لے لیا کرو، اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے۔ سو میرا ہی تقویٰ اختیار کئے رہو، اے اہلِ فہم۔"

اور جس تقویٰ کو یہاں تاکید اور تکرار کے ساتھ کہا گیا ہے، اس کی ایک بڑی شرط ہے گداگری سے احتراز اور دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے احتیاط، اور اپنا بار دوسروں پر ڈالنے سے اجتناب ——— قرآن کے بہترین ترجمانوں نے اس سیاق میں تقویٰ سے

مراد یہی لی ہے۔ کشاف میں ہے :۔

ای اتقوا الاستطعام وابرام الناس والاشتغال علیھم

"یعنی بچو لوگوں سے کھانا مانگنے سے، لوگوں سے لگے لپٹنے سے، اور ان پر بارِ خاطر بننے سے۔

اور مدارک میں ہے :۔

الاتقاء عن الابرام والتشغل علیھم۔

"بچنا ہے لوگوں کے لگے لپٹنے اور ان پر بارِ خاطر ہونے سے ہے"

آیت کے خاتمہ پر تخاطب اولوالالباب یا اہلِ فہم سے خاص طور پر پُرمعنی ہے یعنی غور و فکر خود ہی تمہیں نتیجہ تک پہنچا دے گا۔ اور فہم و تدبّر والے دل سے ایسی پُرحکمت ہدایات کی قدر کریں گے۔ نتیجہ میں انفرادی، اجتماعی، روحانی، اخلاقی و معاشی سارے ہی پہلو فوز و فلاح کے آجاتے ہیں

(۲۲)

اور یہ جو ابھی عرض ہوا ہے کہ روحانی و اخلاقی کے ساتھ مادی فوز و فلاح بھی حاصل ہوگا تو اسے انکار کے کانوں سے نہ سنیئے، اور اسے سُن کر اچنبھے میں نہ پڑیئے معاً بعد تنزیلِ مبارک ہی میں صراحت کے ساتھ ارشاد ہوا جاتا ہے

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (آیت ۱۹۸)

اور کوئی مضائقہ نہیں اس باب میں کہ تم اپنے پروردگار کے پاس سے تلاش معاش کرو

فَضْلًا سے کھلی ہوئی مراد مالی تجارتی منفعت ہے۔ اس مفہوم پر ابن عباس صحابی سے لے کر تابعین تک متحد ہیں، اور یہاں بھی قرآن دوسرے مذہبوں کا خشک غلو توڑ رہا ہے؛ اور رہبانیت کے تصوّر پر ضرب لگا رہا ہے۔

اہلِ جاہلیت کی خشکی کہیئے یا وہم پرستی، اس باب میں اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ حج کے موقع پر جو تاجر مالِ تجارت لے کر منیٰ و مکہ کے بازاروں میں اُترتے تھے، بلکہ جو اونٹ والے اپنے اونٹ مکہ، عرفات، منیٰ، مزدلفہ کو لے جاتے تھے، سمجھا جاتا تھا کہ ان لوگوں کا حج ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جہاں تجارت آگئی، عبادت کا وجود ہی کہاں باقی رہ گیا؟ قرآن مجید اپنے حکیمانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ قدم قدم پر ان ساری غلط فہمیوں اور غلط غیرت سندیوں کے پردے چاک کرتا جاتا ہے، اور حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھاتا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دوسرا خطبہ

(۲۳)

عورت مرد کے باہمی تعلق اور تفاضل کا مسئلہ ہمیشہ سے بڑے معرکہ کا چلا آرہا ہے۔ پرانے فلسفہ اور پرانے تمدن نے مرد کو آسمان پر چڑھا اور عورت کو زیر زمیں اُتار دیا تھا اور فرنگستان جدید میں بھی خال خال کوئی فلسفی مفکر اور سوشیالوجسٹ اس آخری خیال کے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً جرمنی میں شوپنہار Schopenhauer برطانیہ میں کیپٹن لڈوسی اور میڈم شارلیپ Madam Sharlip اور ایران ہو کہ ہندوستان سب کہیں کہاوتیں مثلیں وغیرہ اسی مفہوم کی چلی آرہی ہیں۔ لیکن جدید فرنگستان نے اسی کے ردعمل کے طور پر نظریہ بالکل ہی دوسرا رکھا ہے۔ یہاں عورت سر پر چڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اور قریب ہے کہ صنف نازک کی افضلیت اور اولیت کا اعلان بطور ایک مسلمہ کے ہو جائے۔ اب قرآن نے دیکھیے کیسا محتاط اور متوازن فیصلہ صادر کیا ہے۔

اصل اصولی اور بنیادی فارمولا اس نے یہ بتایا ہے اور وہ بھی کس ایجاز کے ساتھ۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (آیت ۲۲۸)

اور عورتوں کا بھی ویسا ہی حق ہے جیسا کہ ان کے اوپر ہے موافق دستور شرعیہ کے

سلیس و عام فہم اردو میں اسے یوں کہیئے کہ جس طرح مردوں کے حق عورتوں پر ہیں اسی طرح عورتوں کے حق مرد پر ہیں۔ اور یہ نہ سمجھو کہ شوہروں کے حق میں فرائض

بس بیویوں کے ذمہ عائد ہوتے ہیں، بلکہ ایسے ہی فرائض بیویوں کے حق میں شوہروں کے ذمہ بھی عائد ہوتے ہیں اور یہ اصل اصول کی منادی چھٹی صدی کے ایک اُمّی عرب کی زبان سے اُس وقت کرائی گئی، جب دنیا میں یہودیت، نصرانیت، بدھ مت مجوسیت، غرض سبھی مذہبوں کی زبان سے کہلایا یہ جا رہا تھا کہ

"شوہر بیوی کا آقا و مالک ہے، اور بیوی اس کی مملوکہ"

"عورت جہنم کا دروازہ ہے اور ہر بشر میں شر کا باعث اسے حقیر و ذلیل سمجھنے کے لیے، بس یہی کافی ہے کہ وہ عورت ہے"۔

ان دو عبارتوں میں یہودیت اور نصرانیت کی تعلیمات کا خلاصہ آ گیا اور ایسا ہی کچھ حال چین کے حکیم کنفوشس اور ہندومت کے منو جی اور بدھ مت اور مجوسیت وغیرہ کے صحیفوں کا نظر آتا ہے۔ ان سب کے اقتباسات اگر نقل ہوں تو یہ خطبات اپنے اصل موضوع سے دور ہی جا پڑیں۔

اور جب قرآن نے عورت کی یہ اصلاً مساویانہ پوزیشن مضبوط کرا لی، تو اپنی حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کی بنا پر اس اہم تکملہ اور ضروری ضمیمہ کا بھی اعلان کر دیا، کہ

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (آیت ۲۲۸)

اور مردوں کو ان کے اوپر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے۔

قرآن جس طرح جاہلیت قدیم کے اس دعوی کو مسترد کر رہا ہے کہ عورت حقیر و ذلیل ہے۔ اسی طرح جاہلیت جدید کے بھی اس قول بے دلیل کے ماننے سے انکار کر رہا ہے کہ مرد و عورت ہر حیثیت سے مساوی اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں۔ مساوات کامل اور مساوات مطلق دونوں جنسوں کے درمیان نہیں۔ بلکہ مرد کو عورت پر من وجہٍ یا ایک گونہ ترجیح اور فوقیت حاصل ہے ـــــــــ قرآنی لفظ دَرَجَةٌ خوب خیال میں رہے۔ مرد عورت کا مالک نہیں۔ عورت اس کی کنیز، یا زرخرید نہیں۔ بہ لحاظ وجوب حقوق دونوں ایک

سطح ۔ بھوک جس طرح ایک کو لگے گی، دوسرے کو بھی۔ پھر بھی مرد کو عورت پر جسمانی و ذہنی ساخت اور ترکیب کے لحاظ سے ایک حد تک ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔ علوم جدید خصوصاً نفسیات کے جن ماہرین نے اپنی عمریں دونوں جنسوں کے طبعی خصوصیات، جسمانی قوٰے، اور دماغی و ذہنی صلاحیتوں کے مطالعہ و تحقیق میں صرف کر دی ہیں، ان کی بڑی جماعت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم و مکمل ہیں۔ تاہم بلحاظ قوت و بہ لحاظ عقل افضلیت مرد ہی کو حاصل ہے اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت کی بھی ہوئی ہے، وہاں اپنی نسائیت کا خون کر کر کے ۔

اس اثبات افضلیت سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ افضل مفضول پر کسی قسم کا ظلم، زبردستی یا سختی شروع کر دے، یا اس کی تحقیر و تذلیل جائز سمجھ لے۔ بلکہ قوی کو کمزور سے اور زیادہ لطف و حسن مراعات رکھنا چاہیے۔ صحابی عبداللہ بن عباسؓ جس پایہ کے مفسر ہوئے ہیں، معلوم ہے۔ ان کا قول سنئے، جو قرطبی میں نقل ہوا ہے۔

قال ابن عباسؓ الدرجة اشارة الی حض الرجال علی حسن المعاشرة والتوسع للنساء فی المال والخلق ان الافضل ینبغی ان یتعامل علی نفسه، قال ابن عطیة هذا القول نفیس مادح۔

ابن عباس نے کہا ہے کہ لفظ درجہ سے اشارتاً یہ ترغیب مرد کو ہوگئی کہ عورت سے حسن معاشرت رکھے، اور مال اور برتاؤ دونوں میں اس کے ساتھ توسّع برتے۔ اس لئے کہ یہ افضل ہی کی شان ہے کہ اپنے نفس پر برداشت سے کام لے، اور ابن عطیہ نے کہا ہے یہ قول بہت ہی نفیس اور مستحسن ہے۔

اور آیت کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوا ہے:۔

وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ اور اللہ بڑا زبردست ہے اور حکمت والا ہے۔

اللہ بڑی قوتوں کا مالک ہے اور ہر مانع پر غالب ہے، وہ جو احکام اپنے بندوں کو چاہے دے سکتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ بڑا حکیم بھی تو ہے، وہ دیتا وہی احکام ہے جو بیشمار حکمتوں اور مصلحتوں کے جامع ہوتے ہیں۔ بندوں بے چاروں کی نظریں کہاں کہاں تک پہنچ سکتی ہیں ــــ اور اسی شانِ قوت و حکمت کے جلوے او پر تو اس کے سامنے ہی احکام معاشرتی و انتظامی میں نظر آتے ہیں۔

(۲۴)

زندگی سے محبت اور موت سے خوف، انسان کے لئے ایک امر طبعی ہے اس کا لحاظ کرکے جہاد و قتال کے سلسلے میں عین ترغیب و ترہیب کے درمیان قرآن ایک سبق آموز حکایت بھی کسی قدیم قوم کی بیان کرتا ہے اور چونکہ تذکیر کا مدار اس قوم کی تعیین پر نہ تھا۔ اس لئے اس قوم کے زمانے اور وطن کو بالکل مجمل چھوڑے رکھتا ہے اور انجام کا تعارف یوں کراتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۝ (آیت ۲۴۳)

(اے مخاطب) کیا تجھے خبر نہیں ان لوگوں کی جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے، موت کے ڈر سے، اور وہ ہزاروں ہزار تھے۔

رؤیۃ سے مراد ہمیشہ چشم بصارت ہی سے نہیں ہوتی۔ بلکہ خبر معتبر پہنچ جانا، یا غور و فکر سے نتیجہ نکال لینا بھی مراد ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں یہی مراد ہے۔ قرطبی نے کہا ہے:۔

ھذہ رویۃ القلب بمعنی الم تعلم ــ یہ رویت قلب ہے مراد الم تعلم ہے

یعنی تجھے کیا اے مخاطب یہ روایت مستند نہیں پہنچ چکی ہے ؟ ـــــ
اور یہ طرز تخاطب ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب کسی جانے بوجھے واقعہ سے عبرت دلانا ہوتا ہے ۔ راغب میں ہے

اذا عُدّی رأیت بالی اقتضی معنی النظر المؤدی الی الاعتبار
"جب رأیت کا صلہ الی کے ساتھ آتا ہے تو مقصود کسی واقعہ سے عبرت دلانا ہوتا ہے"۔

اور کشاف میں ہے :

"ھذا کلام جری مجری المثل فی معنی العجب ،
"کسی عجیب واقعہ کے لئے یہ طرز کلام آتا ہے"۔

گویا مخاطبین اوّل اہلِ عرب کے لئے یہ واقعہ معروف و معلوم تھا اور اُلوف کا عدد عربی میں ہزارہا ہزار کے لئے آتا ہے ۔ اس کا اطلاق کم سے کم دس ہزار پر ہوتا ہے ۔

فیہ دلیلٌ علی الالوف الکثیرۃ (کشاف)
"اس میں دلیل ہے کہ وہ بہ کثرت ہزاروں میں تھے"۔

وھو جمع الکثرۃ لا یقال فی عشرۃ فما دونہا (قرطبی)
"یہ عدد جمع کثرت کا ہے اور دس ہزار یا اس سے کم کیلئے نہیں بولا جاتا"۔

اور حَذَرَ الْمَوْتِ کی تصریح نے بتا دیا کہ اتنی بڑی آبادی کا گھروں سے باہر نکل پڑنا یوں ہی اور امر اتفاقی نہیں، موت کے ڈر سے تھا ۔

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ (آیت ۲۴۳)
"تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ پھر اس نے انہیں جلا دیا"۔

یعنی اللہ کی مشیت میں ان کی موت ہی مقدر تھی اور جب اس نے یہ ارادہ کر لیا تو کوئی بھی

تدبیر اس کی راہ میں مانع نہ آسکی۔ اور ممکن ہے کہ وہ حکم جہاد ہی کی تعمیل سے جی چرا کر بھاگے ہوں۔ لیکن بالآخر وبا سے یا کسی اور طریقہ سے، اُلٹے سب موت ہی کے شکار ہو کر رہے۔ سو حکم جہاد، جہاد سے بھاگنا، یا بھاگ بچنے کی کوشش کرنا سب بے کار ہے۔

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ، پھر اللہ نے انھیں زندہ کر دیا اور انھیں مشاہدہ کرا دیا کہ موت و زندگی کا سر رشتہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ عقل و تدبیر انسانی کے ہاتھ میں نہیں۔ اسی لئے جہاد یا کسی بھی دوسرے حکم شریعت کی تعمیل سے بھاگ بچنے کی کوشش کرنا انتہائی حماقت اور نادانی ہے۔ کتاب عہد عتیق کے صحیفہ حزقی ایل باب ۳۷، آیات ۱ تا ۱۰ میں ایک روایت بہ صورت کشف و رویا اس سے ملتی جلتی ہوئی موجود ہے۔ اور بعض علمائے عصر نے قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے استناد کر کے یہاں موت و حیات دونوں کو صرف معنوی و مجازی مفہوم میں لیا ہے۔ ان تاویلات کی قرآن میں گنجائش تو نکل سکتی ہے، مگر بہ تکلف۔ اور آیت کا خاتمہ اس ٹکڑے پر کیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ (آیت ۲۴۳)

"بے شک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ البتہ انسان ہی اکثر شکر ادا نہیں کرتے۔"

چنانچہ فضل کرنے والا پروردگار بندوں کو حکم انھیں کے نفع کے لئے دیتا رہتا ہے۔ اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ بندوں کے دل میں جذبات تمام تر محبت کے اور شکر و احسان مندی کے پیدا ہوتے رہیں اور قصے ہوں یا احکام بیچ بیچ میں ایسے مضمون ایسے ہی جذبات کی بیداری اور استحضار کے لئے آتے جاتے ہیں۔

(۲۵)

اس قدیم قوم کی حکایت کے، کہنا چاہیئے کہ بعد ہی ذکر اسرائیل میں حضرت

سموئیل کے زمانہ کی ایک جنگ کا شروع ہو جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (آیت ۲۴۶)

(اے مخاطب) کیا تجھے خبر نہیں کہ موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی، جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم لوگوں کے لیے ایک امیر مقرر کر دیجیے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں۔"

یہ پیغمبر حضرت سموئیلؑ تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے سے کوئی تین صدی بعد، حضرت داؤدؑ سے کچھ ہی قبل، اور سنہ مسیحی سے کوئی دس، گیارہ سو سال قبل سنہ ۱۱۰۰ ق م سے تا سنہ ۱۰۲۰ ق م افرائیم وعلاقہ شام کے کوہستانی شہر رامہ میں آپ کا قیام تھا۔ آیت میں یہ بھی تصریح موجود ہی ہے کہ آپ اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے، آپ کے فرزندوں میں سپہ سالاری اور قیادت کی قابلیت نہ تھی ملک کے دشمنوں نے خاص طور پر اٹھا لیا تھا اور اسرائیلیوں کو شکست ہو رہی تھی۔

مَلِكًا عربی میں عام ہے۔ ہر صاحب قوت واقتدار کے لئے ہے۔ یہاں سیاق میں مراد امیر جیش یا سردار فوج سے ہے۔ توریت میں اس موقع پر ہے:

"تب سارے اسرائیل بزرگ جمع ہو کر رامہ میں شموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا ہے اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے"

(۱- سموئیل ۸ : ۴، ۵)

اسرائیلی تصور بادشاہی میں فوج کی سرداری لازمی تھی، اور یہ درخواست گزار سب مذہبی لوگ تھے، ملک گیری وکشور کشائی مقصود نہ تھی، جنگ فی سبیل اللہ مقصود تھی۔ نقاتل

کے ساتھ قید فِی سَبِیلِ اللہ کی درخواست ہی میں لگی ہوئی تھی اور یہ نہیں کہ خود جس کو چاہیں خود رائی سے سردار مقرر کر لیں۔ پیمبر وقت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست اُن سے کی، کہ وہ امیر جیش کسی کو مقرر کریں۔

مذہبیت اور دینی ذہنیت کے ان مظاہروں کے باوجود پیمبر نفسیت بشری سے بھی خوب واقف تھے اور اپنی قوم کی نفسیت سے تو شاید کچھ اور زیادہ ہی۔

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا

"بولے کہ کہیں یہ تو نہیں کہ تم پر قتال فرض کر دیا جائے اور پھر تم قتال نہ کرو"

بلکہ کلمہ 'ھَل' سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمویل یہی کچھ سمجھ بھی رہے تھے

قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا (آیت)

(قوم والے) "بولے کہ ہمارے لئے کیا ایسا باعث ہو سکتا ہے کہ ہم قتال نہ کریں خدا کی راہ میں بلکہ ہم اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے نکالے بھی جا چکے ہیں"۔

یعنی یہ بھی کوئی بات ہے کہ خود ہی آپ سے جنگ کا تقاضہ کرنے آئے ہیں اور جب اس کا حکم صادر ہو جائے گا اور جہاد فریضہ مذہبی خدا کی راہ میں تو اس حکم کے بعد اس کی تعمیل سے جی چرانے لگیں۔ خصوصاً جب کہ ہم کو ان کے ہاتھوں اتنے جانی و مالی نقصان بھی اُٹھانا پڑ چکے ہوں! ـــــــ لیکن بات آخر ان کے پیمبر ہی کی سچی نکلی:۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ط

"لیکن جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو وہ اب نکل گئے بجز ان میں سے تھوڑوں کے"۔

ان کے قدیم ترین مورخ جوزیفس کی Antiquities of The Jews میں ہے:۔

"ان پر دہشت طاری ہو گئی یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے، بعضوں نے زیرِ زمین غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دریائے یردن عبور کر گئے" (باب ۶ فصل ۶ فقرہ ۱)

اور اس حقیقت سے اندھے رہے کہ:-

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (آیت ۲۴۶) "اللہ خوب واقف ہے ظالموں سے"۔

اپنے نافرمان بندوں اور ان کی سزا پر بھی ہر طرح قادر ہے

اس کے بعد کیا ہوا؟ اسے بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیئے :-

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا (آیت ۲۴۷)

"ان کے پیمبر نے ان لوگوں سے کہا کہ اللہ نے تم پر طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے"۔

یہ طالوت کون اور کیا تھے؟ نبی اور رسول کچھ نہ تھے محض امیر جیش تھے اور تاریخ نے ان کو اسرائیل کا پہلا بادشاہ تسلیم کیا ہے۔ زمانۂ حکومت ۱۰۲۵ قبل مسیح سے لے کر ۱۰۱۲ قبل مسیح تک۔ توریت میں اس کا نام (Saul) ساؤل کر کے آیا ہے توریت میں حسب معمول بڑی طوالت بیان کے بعد ہے :-

"سو جب سموئیل ساؤل سے دوچار ہوا تو وہیں خداوند نے کہا کہ دیکھ یہی شخص ہے، جس کی بابت میں نے تجھ سے کہا تھا کہ یہی میرے لوگوں پر ریاست کرے گا" (۱-سموئیل- ۹ - ۱۵ - ۱۶)

اب اور آگے سنیئے۔ سموئیل نبی اپنی اُمت کے کیسے رمز شناس تھے، ان کی فراست توقع سے بھی بڑھ کر ٹھیک نکلی۔ کہاں تو تقاضہ پر تقاضہ تھا کہ امیر جیش کا انتظام ہو جائے اور اب جب خدائی انتخاب کے واسطے سے ہو گیا، تو لگے کہنے، واہ یہ بھی کوئی انتخاب ہو سکتا ہے۔

قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ (آیت ۲۴۷)

"بولے اس کو ہمارے اوپر امیری کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم امارت کے حقدار اس سے بڑھ کر ہیں اور نہ اسے مال ہی میں وسعت دی گئی ہے"۔

طالوت کی جو حقارت اسرائیلیوں کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی تھوڑی سی شرح تاریخ کی زبانی بھی سُن لیجیے۔

اسرائیلی بارہ قوموں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں سب سے چھوٹا قبیلہ بن یامین کا تھا، اور طالوت اتفاق سے اسی قبیلہ کے تھے، تو ایک باعث ان کے حقیر سمجھے جانے کا یہ نکل آیا۔ نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے، تو ہندوؤں کی طرح ذات پات، بلکہ چھوت چھات کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوؤں کے برہمن اور چھتری کی تفریق و امتیاز کی طرح اب اسرائیلیوں کا بھی عقیدہ یہ قائم ہو گیا تھا کہ نبوت حق مخصوص ہے بنی لاوہ کا اور حکومت حق مخصوص ہے بنی یہوداہ کا۔ یہود کا قول تھا کہ طالوت، نہ اس میں نہ اس میں، پھر حاکم یہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہندو عوام کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ کوئی شخص، نہ برہمن نہ چھتری وہ حاکم اعلیٰ یا سردار کیسے تسلیم کر لیا جائے۔؟

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ برہمن یا چھتری نہیں ہیں نہ سہی، یہ ویش بھی تو نہیں۔ مہاجن یا ساہوکار طبقہ کے بھی تو نہیں، جاہ و مرتبہ میں نہ سہی، کم سے کم مال و دولت ہی میں ہمارے عوام سے ممتاز ہوں! منصب امارت کے لائق تو مالی اعتبار سے بھی نہیں!

مکالمہ میں آپ سامعین و حاضرین کا دل لگ رہا ہے؟ اب بنی وقت کا بیان بھی سُنئے۔

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ (آیت ۲۴۷)

"فرمایا کہ اسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں انتخاب کر لیا ہے، اور اسے علم

اور جسم (دونوں) میں کشادگی زیادہ دی ہے اور اللہ جسے چاہتا ہے اسے اپنا ملک دے دیتا ہے"۔

آپ نے پہلا اور اصلی جواب تو یہی دیا کہ یہ انتخاب اللہ کا کیا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر طرح پر حکمت و پر مصلحت بھی ہوگا، بندوں کے ذہن بھی ان باریک مصلحتوں تک نہیں پہونچ سکتے

توریت نے اسے یوں ادا کیا ہے:

"اور سموئیل نے جماعت کو کہا کہ تم اسے دیکھتے ہو، کہ جسے خدا نے چُن لیا، تو اس کی مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں (ا سموئیل - ۱۰-۲۴)

اور دوسرا جواب عقلی قسم کا یہ دیا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو اور تمہارے معیار سے بھی سردار فوج میں بس یہی دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اسے سپہ داری اور ملک گیری کے فنون سے واقفیت ہو، سو وہ طالوت کو حاصل ہے، دوسرے خود اس کی جسمی وجاہت و توانائی، اسکی اہمیت اس زمانہ کی دست بہ دست لڑائیوں میں مسلّم تھی اور طالوت اس میں بھی ممتاز تھے۔

فِی الْعِلْمِ سے مراد سیاق میں علوم ملک گیری و ملک داری کے ہیں، ابن عباسؓ نے کہا ہے ای علم الحرب اور روح المعانی میں ہے من حرفۃ الامور السیاسیۃ۔

فی الجسم مراد ہے کہ قد و قامت اور وجاہت ظاہری میں طالوت دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں ای فی الطول و القوۃ۔

توریت کی دی ہوئی تفصیلات سے طالوت کے حلیہ کا نقشہ ذہن میں جما لیجیے۔

"بہت خوب جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زائد خوب صورت کوئی شخص نہ تھا۔ یہ ساری قوم میں کاندھے سے لے کر اوپر تک ہر ایک سے اونچا تھا۔" (ا۔ سموئیل ۹-۱)

ایک دوسری جگہ :-

"اور وہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے لمبا تھا" (۱۔ سموئیل ۔ ۱۰ = ۱۳)

اور یہ دراز قامتی، اسرائیلوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لئے تھی، توریت کے بعد مقدس ترین نوشتہ ان لوگوں کے ہاں تلمود ہے۔ ذرا اس کی تصریح ملاحظہ ہو:

" خداوند تبارک وتعالےٰ اپنی سکینت کا نزول صرف اسی شخص پر کرتا ہے جو دانشمند ہو مضبوط ہو، اور دراز قامت ہو" (EVERY MAN'S TALMOOD ص ۱۲۸)

قرآن مجید کی اس نکتہ رسی کی داد دیجئے کہ اس نے نام ہی ایسا رکھا جس سے طول قامتی کی طرف پورا اشارہ ہو رہا ہو۔ ہمارے ہاں کے اہلِ تحقیق کا گروہ اسی طرف گیا ہے۔ چنانچہ صاحبِ معالم نے کہا ہے کہ کان طالوت اسمہ بالعبرانیۃ ساؤل فسمی طالوت بطولہ۔ اور روح المعانی میں ہے، قال انہ عربی من الطول واصلہ الطولون۔

يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ، اس کی مِلک تو ہر ملک ہے وہی اپنا ملک جس کو چاہے دے۔ وہی ہر طرح مالک و مختار ہے اور آیت کا توڑ ان مختصر سے لفظوں پر ہوا ہے۔

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ جیسے اردو میں یوں کہئے کہ اس کا اختیار بھی غیر محدود اور اس کا علم بھی محیط کل ———— وہ بڑی ہی وسعت والا ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہی ہر پست کو بلند اور ہر ادنیٰ کو سرفراز کر دینے والا ہے اور اس کا علم بھی محیط و کامل ہے، وہی تو واقف ہے کہ کون ملک داری اور ملک گیری کی صلاحیت رکھتا ہے۔

نبی اپنی امت کی اعجوبہ پرستی اور خوارق پسندی سے واقف تھے، جوابات تو

ان کے اعتراض کے معقول وکافی دے چکے تھے، پھر بھی کچھ دیر مغز پاشی ضروری مناسب معلوم ہوئی۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (آیت ۲۴۸)

"ان کے نبی ان سے بولے، کہ اس کی امارت کا نشان (یعنی جو تمہارے اطمینان کا کام دے سکے) یہ ہے تمہارے پاس وہ صندوق (از خود) آجائے گا۔ جس کے اندر تمہاری تسکین کا سامان تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، اور کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی، جنھیں آل موسیٰ و آل ہارون چھوڑ گئے ہیں، اسے فرشتے لے آئیں گے۔ بیشک اس واقعہ میں تمہارے لئے نشانی ہے۔ اگر تم ایمان والے ہو"۔

تقریر میں تابوت سکینہ ایک قصہ طلب لفظ آگیا ہے۔ اس تلمیح کو آپ بھی سمجھ لیجئے تو گتھی بالکل کھل جائے اور بات خوب روشن ہو کر رہے۔

یہ اصطلاحی نام ایک خاص تابوت کا ہے، جو بنی اسرائیل کا اہم ترین قومی وملی ورثہ تھا اس کے اندر اصل نسخہ توریت کا تھا، اور انبیاء وبنی اسرائیل کے تبرکات محفوظ تھے، اسرائیلی اس کو برکت وتقدیس کی متاع عزیز سمجھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے۔ سفر وحضر، جنگ وامن ہر حال میں اسے بڑی عزت وحفاظت سے کے ساتھ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اور اپنی ساری خوش بختی اس کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے۔ یہ صندوق کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علمائے یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش یہ تھی: طول $2\frac{1}{2}$ فٹ، عرض $1\frac{1}{2}$ فٹ، بلندی $1\frac{1}{2}$ فٹ۔ مدت دراز ہوئی فلسطینی ایک جنگ میں

ان سے یہ چھین لے گئے تھے، اسرائیلی اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست اور بدطالعی سمجھ اس کی بازیابی کے لئے نہایت درجہ مضطرب و پریشان تھے۔ طالوت کے وقت میں اس کی واپسی کے بعد یہ تابوت ان کے قبضہ میں حضرت سلیمان (متوفی ۹۳۲ ق،م) تک رہا، اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسے بھی اسی میں رکھ دیا تھا، اس کے بعد سے پھر اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن کردیا گیا ہے۔

قرآنی لفظ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ سے خصوصی اشارہ توریت شریف کے نسخۂ اشفا کی جانب ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کی چھوڑی ہوئی چیزوں سے مراد ان دونوں پیمبروں اور ان کی بزرگ اولاد کے تبرکات و آثار ہیں۔

تاریخ یہود کا بیان ہے کہ فلسطینی اس مقدس تابوت کو چھیننے کو تو چھین لائے۔ لیکن جب سے ایک دن بھی چین سے نہ بیٹھنے پائے۔ ابھی وبا کا زور ہے، ابھی کوئی اور مصیبت، آخر عاجز آکر یہ طے کیا کہ خود تابوت یعنی اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھنکوا دیا جائے۔ چنانچہ ایک بیل گاڑی پر اسے لاد کر بغیر گاڑی بان کے یوں ہی ہانک دیا۔ بیل سیدھے علاقۂ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہوگئے اور گاڑی اُن کے شہر بیت شمس میں آکر ٹھہر گئی۔

تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ کی خبر کو حیرت کے کانوں سے نہ سنیئے۔ ایسے موقعوں کے لئے ہمیشہ یہ نکتہ حافظہ میں رکھیئے کہ تکوینی تصرفات، جب بھی حکم الٰہی سے ہوتے ہیں، کیا معمول کے موافق کیا معمول سے الگ، ہمیشہ فرشتوں ہی کے ذریعہ ہوتے ہیں اور کلام الٰہی میں ہر فعل و عمل کے لئے محاورہ فرشتوں ہی کا استعمال ہوتے ہیں۔ پانی سے بھرے ہوئے بادل فرشتے ہی لاتے ہیں۔ آندھی کے جھکڑ فرشتے ہی چلاتے ہیں، قحط، وبا، زلزلے سب فرشتوں ہی کی معرفت ظہور میں آتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی

بیلوں کا رُخ اسرائیلی علاقوں کی جانب پھیر دینا فرشتوں ہی کا کام تھا۔ یہ ایک غیبی نشان تھا، طالوت کی تائید میں، اور مبارک فالی تھی اس کے حق میں۔ اس حیرت انگیز واقعۂ بازیابیٔ تابوت کی طرف اشارہ کر کے نبی وقت اپنی اُمت سے کہتے ہیں کہ تمہارے اطمینان کے لئے تصرف غیبی کا ثبوت موجود ہو گیا۔ اس قیل و قال اور مذاکرے اور مکالمے کے بعد، جب اُمت طالوت کی کمان میں، قتال پر آمادہ و مستعد ہو گئی تو خود سردار جیش کو ایک ضرورت گفتگو کی فوج والوں سے پیش آ گئی۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ (آیت ۲۴۹)

"جب طالوت فوج والوں کو لے کر آگے بڑھے تو بولے کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ لینا چاہتا ہے"۔

جس دریا کا ذکر ہے وہ فنا نہیں ہو گیا ہے، آج تک موجود ہے، اس کا نام یردن، انگریزی تلفظ میں (Jordon) کوئی بڑا دریا نہیں، کہنا چاہیے کہ منبع سے دہانہ تک براہ راست لمبائی کُل ۱۳۰ میل کی۔ البتہ درمیانی پیچ و خم ملا کے لمبائی کی میزان کوئی تین سو میل تک پہونچ جاتی ہے۔ علاقۂ فلسطین میں گویا اہم ترین دریا یہی ہے۔ اور علاقہ کی قدرتی سرحد کا کام بھی یہی دیتا ہے چنانچہ دریا کے اِس پار اور اُس پار (اِس ورے اور اُس ورے) کے علاقوں کی تقسیم خود توریت میں موجود ہے۔ اور یہ غور کرو صحیفۂ یوشع کے باب اول کی آیات ۱۴-۱۵ میں ہے۔ اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی جانب ہے اور بحر جلیل (Sea of Galilee) اور بحر طبریہ (sea of Tibriya) ہوا بحر المیت یا بحر مردہ (Dead Sea) میں جا گرتا ہے۔ پانی شروع کے حصہ میں صاف و شفا بخش و شیریں ہے۔ لیکن آگے چل کر گندلا، بدبودار اور مضر صحت ہو جاتا ہے۔

تو تمہارے صبر و ضبط (ڈسپلن) کا امتحان، مشیت و حکمت الٰہی سے اسی دریا

کے ذریعہ ہوگا۔

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ج

"پس جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہے۔

وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ

"اور جو کوئی اسے نہ چکھے گا وہی میرا ہے، ہاں کوئی ان میں چلو بھر اپنے ہاتھ سے پی لے (تو اس کا مضائقہ نہیں)

"میرا نہیں ہے" سے یہ مراد نہیں کہ وہ میرے دین و کیش سے خارج ہے، بلکہ مراد یہ کہ میری فوجی اطاعت سے باہر ہے، اور میرے قائم کئے ہوئے ڈسپلن کا پابند نہیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ موسم گرمی کا تھا اور سپاہیوں کو پیاس زور کی لگی ہوئی تھی۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اصل حکم تو وہی ملا تھا کہ کوئی ابھی راستہ میں یہ پانی زبان پر نہ رکھے۔ اور یہ دوسرا حکم بہ طور رخصت و اجازت تھا، کہ خیر ایک آدھ چلو سے منھ تر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ——— باقی قصہ آگے سنئے:

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ط "لیکن پانی سب نے اس سے پی لیا، بجز ان میں چند آدمیوں کے"

یعنی خلاف حکم اچھی طرح سیر ہو کر پی لیا۔ جس کے بعد چلنا خصوصاً فوجی مارچ کرنا دشوار ہو گیا۔ باز رہنے والوں کی تعداد جو قرآن نے تھوڑی ہی بتائی ہے، وہ حسب روایت توریت تقریباً چھ سو تھی "۔ تب سموئیل نے ان لوگوں کو جو اس کے پاس حاضر تھے، گنا اور وہ مرد قریب چھ سو کے تھے (۱۔ سموئیل۔ ۱۳ = ۱۵)

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ط (آیت ۲۴۹)

"پھر طالوت اور جو مومنین ان کے ساتھ تھے، دریا کو پار کر گئے۔ تو وہ لوگ

بولے آج تو ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے مقابلہ کی سکت نہیں"۔

جالوت فلسطینوں کے لشکر کا سردار بڑے تن و توش کا پہلوان تھا۔ انسان کاہے کو تھا، اچھا خاصا دیوزاد تھا۔ توریت میں اس کی جسامت، قد و قامت، اسکی شہ زوری اس کے ہتھیار، ان سب کی تفصیلات موجود ہیں، ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قد دس فٹ کا تھا، بجز چہرے کے سر سے پیر تک آہن پوش رہتا تھا، اور اس کی سپر کا وزن کوئی تین من کا تھا۔

دشمن کو اپنے سے قوی و زبردست پاکر اچھے اچھے ایمان والوں کی ہمت طبعی طور پر جواب دے جاتی ہے۔ جوزیفس اسرائیل کی تاریخ آثار یہود میں ہے کہ طالوت اور اس کے لشکری یہ سامان دیکھ کر سہم اٹھے" (باب ۶ - ۹ = ۱۰)

اور خود توریت کا بیان ہے۔

"جس وقت ساؤل اور سارے اسرائیل نے اس فلسطینی کی بات سنی تو ان کی دلاوری نکل گئی، اور وہ نپٹ ڈر گئے" (۱۔ سموئیل - ۱۷ - ۱۱)

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا اللَّهِ ۙ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ○ (آیت ۲۴۹)

"وہ لوگ جنھیں یقین تھا کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، بولے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

طالوت کے لشکر میں مومن تو سبھی تھے، لیکن بہتوں پر دشمن کے ظاہری ساز و سامان کی دہشت طاری ہو گئی، اور طبعی طور پر اس کی شان و شوکت سے مرعوب ہو گئے۔ البتہ کچھ ایسے بھی تھے جن میں آخرت کا عقیدہ تر و تازہ اور مستحضر تھا، وہ اس وقت پر

بھی اپنے ایمان پر استقلال کے ساتھ قائم رہے اور ذرا بھی متزلزل نہ ہوئے اور حقیقت تو یہی ہے کہ اللہ صابرین کا ساتھی ہے۔ اس کی نصرت و توفیق انھیں لوگوں کے ساتھ ہے اور آخرت کا استحضار جن لوگوں میں ہے وہی ان میں جرأت و بے خوفی پیدا کرتا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آیت ۲۵۰)

"جب جالوت اور اس کے لشکریوں کے مقابل آئے تو بولے کہ اے پروردگار ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جما دے اور ہمیں غالب کر کافر لوگوں پر"

یہ دو آیتیں جو ابھی آپ کے سامنے تلاوت ہوئیں، ان میں عام تعلیم اللہ کے سپاہیوں کو آداب جنگ کی ہے کہ کامل تکیہ سپاہیوں کو بجائے اپنی قوت و شوکت کے نصرت الٰہی پر ہونا چاہیئے۔

قرآن کا بیان تو آپ سنتے ہی چلے آرہے ہیں۔ اور توریت کا بیان جس کا جی چاہے، خود توریت میں پڑھ کر دیکھ لے، توریت میں نفس جنگ کے خشک و خارجی واقعات تفصیل قرآن سے کہیں زائد ہے۔ اور وہ یس یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی کتاب تذکرہ و تاریخ کی ہے۔ قرآن مجید اس کے برعکس ہر موقع پر تعلیم، اصول توحید اور اخلاق عالی کی دیتا جاتا ہے، اور یہی وہ اس موقع پر بھی کر رہا ہے۔

چنانچہ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا میں سب سے پہلے یہی درخواست کی ہے، کہ ہمیں توفیق صبر و ثبات قلب کی ہو، اور ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا میں صراحت اسی دعا کی ہے کہ ہمیں ثبات قدم نصیب ہو۔ رہی وَانْصُرْنَا کی دعا تو ثبات قلب و ثبات قدم کے بعد دشمن پر ظفر و غلبہ تو شاید بہ طور قدرتی نتیجہ کے حاصل ہو ہی جاتا۔ لیکن مومنین صادقین کی نظر اپنے سارے انتظام اور ساری سعی و تدبیر سے کہیں بڑھ کر نصرت و تائید الٰہی پر رہتی ہے

اور پھر آخر میں صراحت عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ کی ہے۔ یعنی جنگ کوئی ملکی یا دنیوی نہیں دینی و اعتقادی ہے، مقابل محض دشمن نہیں، کافر ہیں۔ مقصود فتح اور غلبہ دشمنوں پر نہیں، بلکہ کافروں اور دین کے دشمنوں پر ہے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ (آیت ۲۵۱)

"پھر انھوں (طالوت والوں) نے انھیں (جالوت والوں کو) شکست دیدی اللہ کے حکم سے اور جالوت کو داؤد نے قتل کر ڈالا۔"

بِاِذْنِ اللّٰهِ کی قید ملاحظہ رہے۔ اذن توفیق کے معنی میں ہے۔ مقبولین کا کوئی سا بھی کارنامہ ہو، اس قید سے پیچھا چھوٹنے نہیں پاتا۔ یاد دہانی ہر جگہ ہوتی رہتی ہے۔ کہ بندہ بیچارا کیا کرے گا۔ جب کچھ بھی اس سے بن پڑتا ہے، تائید و توفیق حق ہی سے ہوتا ہے۔ جنگ و ترتیب جنگ کی منظر کشی توریت میں بھی ہے، لیکن بس وہی فکری نقطۂ نظر سے۔

وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ ۔ دشمن کے بطل جلیل اور سردار اعظم جالوت کی ہلاکت داؤد کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ داؤد کون تھے؟ آگے چل کر تاریخ اسرائیل کے ایک نامور ہیرو ہوئے۔ ملک و سلطنت سے سرفراز ہوئے اور نبوت سے بھی۔ اس وقت لشکر طالوت کے ایک عام سپاہی تھے، زمانۂ حکومت ۱۰۱۲ ق۔م سے ۹۷۲ ق م تک رہا۔

قرآن مجید میں آپ کا ذکر چھ مرتبہ آیا ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس نوعمر سپاہی نے ایک پتھر اپنے فلاخن میں رکھ کر ایسا اس کے کھینچ کر مارا کہ پتھر اس کے ماتھے کو توڑتا ہوا اس کے دماغ کے اندر پیوست ہو گیا اور جالوت تڑپ کر معاً دنیا سے رخصت ہو گیا۔

وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ (آیت ۲۵۱)

اور اللہ نے اسے حکومت عطا کی اور حکمت بھی اور اسے سکھلایا جو کچھ کہ چاہا۔

یہ بادشاہی ایک خدائی عطیہ تھی۔ پہلے تو قرآن نے اسی کو صاف کیا ہے کہ یہ فرمانروائی ان کے واسطے سے قوم اسرائیل کو عطا ہوئی تھی۔ آپ نسل اسرائیل کے دوسرے تاجدار ہوئے ہیں

پہلے تاجدار طالوت تھے اور آپ ان کے داماد بھی تھے۔ طالوت جب اپنے بڑے فرزند کے ساتھ میدان جنگ میں کام آگئے تو قبیلہ یہودا نے آپ کو بادشاہ منتخب کیا اور دو سال کی کشمکش کے بعد قوم کے باقی قبیلوں نے بھی آپ ہی پر اتفاق کر لیا۔ سات سال تک آپ نے پایۂ تخت ہبرون (Hebron) کو رکھا اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے چھڑا کر اسے اپنا دار السلطنت بنایا۔ گردو پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا۔ اپنے حدود سلطنت کو خوب وسیع کیا۔ آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات اور حسن انتظام کے لحاظ سے یادگار ہے۔

وَالْحِكْمَةَ حکمت کے لفظی معنی دانائی کے ہیں۔ یہاں مراد نبوت ہے، جو خود انتہائی نام دانائی کا ہے عَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ علوم انبیاء کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ مِمَّا يَشَاءُ کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون و صنائع آگئے جو آپ کو تعلیم ہوئے تھے۔

قصہ طالوت طویل ہو کر بیان ہوا۔ آخری آیت کا آخری ٹکڑا بطور ضمیمہ یا تکملہ کے ہے اور اسی میں قصہ کا خلاصہ بھی آگیا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ (آیت ۲۵۱)

اور اگر اللہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا تو روئے زمین پر فساد برپا ہو جاتا۔ لیکن اللہ تو جہان والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے

اس لئے اللہ اپنے فضل و کرم سے اس فساد عظیم کی نوبت نہیں آنے دیتا اور بدکاروں کو نیک کاروں کے، اور نافرمانوں کو فرمانبرداروں کے ذریعہ ہٹاتا اور مٹاتا رہتا ہے لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ بدی و بدکاری سے روئے زمین پر فساد عظیم برپا ہو کر رہتا۔

یہاں یہ عام قانون بتا دیا گیا کہ دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوا کرتے ہیں یہ یونہی بلا ضرورت و مصلحت محض گردش گردوں سے نہیں ہو جایا کرتے بلکہ ہمیشہ بامقصد

پر حکمت ہی ہوا کرتے ہیں۔ اور ان سے ظلم و طغیان و عصیان کی اصلاح مدنظر ہوتی ہے اور یہیں اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ اس عالم اسباب میں مشیت تکوینی جو کام بھی لیتی ہے، بندوں ہی کے ذریعہ و واسطے سے لیتی ہے اور روئے زمین پر فساد عظیم کے برپا ہو جانے پر جو شئے روکے ہوئے ہے وہ اللہ کا فضل عظیم ہی ہے۔

یاد کر لیجیے اس لمبے قصے کے ذرا قبل حکم جہاد کا ملا تھا، اور ترغیب قتال کی شروع ہوئی تھی، طریق جہاد، آداب جہاد، متعلقات جہاد کے سلسلے میں کتنی ہدایتیں کتنی بصیرتیں اس ایک تاریخی قصے کے ضمن میں فراہم ہو گئیں۔

(۲۶)

اس قصہ کے خاتمہ پر مخاروئے سخن براہ راست صاحب قرآن کی طرف ہو جاتا ہے اور آپ سے مخاطب ہو کر ارشاد ہوتا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ (آیت ۲۵۲)

یہ اللہ کی آیتیں ہیں کہ ہم انھیں آپ کو (اے رسول) پڑھ کر سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک۔

بِالْحَقِّ یعنی غرض صحیح کے ساتھ اور بالکل بے کم و کاست۔ یہ گویا پرزور اعلان اس کا کہ صحیح و مستند بیان قرآن ہی کا ہے، یہ نہیں کہ دوسری الہامی کتابوں اور مذہبی نوشتوں کی طرح کے قصے ادھورے یا مبالغہ آمیز یا مسخ شدہ ہو کر رہ گئے ہوں۔ اور اس کی ایک واضح مثال یہ قصۂ طالوت ہی ہے۔ بائبل والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔

وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (آیت ۲۵۲)

تو آپ یقیناً فرستادوں میں سے ہیں۔

آپ اپنے پیغمبر برحق ہونے میں اصلاً شک و شبہ نہ کیجئے۔ اور حقائق کا نزول برحق پیمبروں ہی پر ہوتا ہے۔ لفظ اَلْمُرْسَلِیْنَ کی معنویت قابل غور ہے، انبیاء کی حیثیت اسلام میں تمام تر قاصدوں، سفیروں، فرستادوں اور بھیجے ہوؤں کی ہوتی ہے اور جو مرسل (بھیجا ہوا) ہوتا ہے وہ کسی کی طرف سے کسی کے پاس ہی بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مرسلین یا پیامبر نہ اوتار ہوتے ہیں نہ دیوتا، نہ خدا کے مظہر ہوتے ہیں۔ نہ خدا ان کے اندر حلول کئے ہوتا ہے۔ معبودیت یا نیم معبودیت کی صلاحیت ان میں ذرا بھی نہیں ہوتی۔ اللہ اکبر! ـــ شرک بلکہ شائبہ شرک سے بچنے کا بھی قرآن مجید کو کتنا اہتمام ہے الفاظ تک کے انتخاب میں وہ اس کا کیسا لحاظ رکھتا ہے۔

لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ کی ترکیب سے یہ بھی نکل آیا کہ آپ دنیا سے نرالے یا انوکھے کوئی مرسل نہیں بلکہ آپ اس زمرۂ مرسلین کے ایک فرد ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔

﴿۲۷﴾

اور اس سلسلے میں یہ مسئلہ بھی کس خوبی سے حل کر دیا ہے۔ کہ پیمبر پیمبر سب یکساں مرتبہ عظمت و احترام کے نہیں ہوتے۔ گو احترام مشترک سب میں رہتا ہے۔ بادشاہ کے صوبہ داروں میں تفاضل بھی پایا جاتا ہے، گو فضیلت سب میں مشترک ہوتی ہے اور شرف تقرب سے کوئی خالی نہیں ہوتا!

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ (آیت ۱۵۳)

اور رسولوں میں ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دے رکھی ہے۔

فَضَّلْنَا میں ضمیر جمع متکلم کا خیال رہے۔ یہ تفضیل و افضلیت جو کچھ ہے، وہ محض عنداللہ ہے، خالق کے ہاں درجات و مراتب قرب کے اعتبار سے ہے۔ خلق کے لئے بہ حیثیت مطاع و مقتدا سب یکساں ہیں۔ اکرام و تعظیم سب کی واجب ہے (اور اسی

معنی ہیں قرآن مجید کی ایک دوسری آیت کا جزو اسی پارے کے اندر لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ آرہا ہے) چنانچہ:

مِنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ

انھیں میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے (براہ راست بلا واسطہ ملائکہ) جیساکہ خصوصیت کے ساتھ موسیٰ کلیم اللہ کے لئے آیا

وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَٰتٍ ۚ اور کسی کے اُن میں سے درجے بلند کئے ہیں، جیسے ہمارے رسول سرور انبیاء، جامع کمالات، وخاتم النبوت تھے مفسر زمخشری نے یہ خوب کہا ہے کہ جہاں شناخت وتعیین میں کوئی دقت نہ ہو، وہاں کنایہ صراحت سے بڑھ کر بلیغ و مؤثر ہوتا ہے:

وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدْنَٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ (آیت ۲۵۳)

اور عیسیٰ بن مریم کو ہم نے شواہد عطا کئے اور ہم نے ان کی تائید کی روح القدس کے ذریعہ (کہ وہ بھی انھیں پیمبران برحق میں سے تھے)

ابْنَ مَرْيَمَ ۔ یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند، نہ ابن اللہ یا کچھ اور۔ عیسیٰ علیہ السلام بہ ایں مرتبہ وجلالت بہرحال ایک بشر ہی گوشت و پوست کے بنے ہوئے اور انسانی شکل وصورت رکھنے والی ہی عورت کی اولاد تھے، نہ خدا تھے نہ خدازادے، نہ الوہیت کا کوئی شائبہ اپنے اندر رکھتے تھے، انھیں خدا کا بیٹا ٹھہرانا بڑی جہالت تھی، اور اسی لئے تو ضرورت پیش آگئی انھیں صراحت کے ساتھ ابن مریم کہنے کی، کہ محض اسی نشان دہی سے اور اسی پتے ہی سے ضرب لگ جائے عقیدۂ نصرانیت پر، ورنہ قرآن نے اتنے پیمبروں کا ذکر کیا ہے، کسی کا تعارف یہ کہہ کر نہ کرایا کہ فلاں ابن فلاں۔ اس طرح کا تعارف مخصوص ہے ابن مریم کے لئے۔ کہ انھیں کے لئے تو عقیدۂ ابن اللّٰہیت کی تردید کی

ضرورت تھی، الْبَیِّنَاتِ یعنی شواہد، ان کی حقانیت و پیمبری کے۔ اور اس کے تحت وہ دلائل و خوارق سب ہی آگئے جنھیں دیکھ کر ہر عقل سلیم نبوت عیسوی کی قائل ہو جائے ابھی تردید ہو رہی تھی شرک نصرانیت کی، اب تردید ہو رہی ہے الحاد یہودیت کی۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ، آپ پیمبر برحق اور مؤید من اللہ تھے۔ نہ کہ نعوذ باللہ شعبدہ باز یا بازی گر، نصرانیوں نے جس طرح غلو و افراط کر کے آپ کو حد عبودیت سے اونچا اچھال دیا تھا۔ اسی طرح یہود نے عناد و تفریط سے کام لے کر آپ کو بازی گر و شعبدہ باز قرار دے دیا تھا۔ امر حق اور قول فیصل اب قرآن کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔

وَاَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کہ روح القدس قدم قدم پر آپ کی محافظت و مدافعت دشمنوں سے کرتے تھے۔

یہ روح القدس عیسائی تثلیث والے کوئی اقنوم نعوذ باللہ نہ تھے۔ بلکہ اسلامی اصطلاح میں یہ لقب ہے فرشتۂ اعظم حضرت جبریل کا، جبریل ملکوتی مخلوق ہیں عند اللہ نہایت مقرب۔ لیکن بہر حال مخلوق ہی ہیں، اور کوئی بھی شائبہ الوہیت کا اپنے اندر نہیں رکھتے۔

وَاَیَّدْنٰهُ ان کی تائید ہم نے کی، جو قادر علی الاطلاق ہیں، اور یہ تائید کوئی خود بخود تو نہیں مل گئی۔ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عیسیٰ مسیح بہ ایں ہمہ فضائل و کمالات بہر حال انسان ہی ہیں۔ انسانوں کی طرح دفع ضرر اور حصول نفع دونوں کے لئے دستگیری حق کے محتاج۔ اور قدرت کاملہ نے ان کی حفاظت، رفاقت، و تقویت کے لئے ڈیوٹی ایک دوسری مخلوق لطیف و غیر مرئی جنس کی لگادی!

(۲۸)

آیت الکرسی کی مشہور آیت سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کی تمہید کی آیت یہ ہے:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ

اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (آیت ۲۵۴)

اے ایمان والو جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو اللہ کی راہ میں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ تجارت کام آئے گی نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔

انفاق یعنی صرفِ مال کا ذکر بسیاق مدح میں جہاں کہیں بھی قرآن مجید میں آتا ہے، ظاہر ہے کہ نیکی یا راہ خدا ہی میں آتا ہے۔ اس کے لئے یہاں یہ پہلے ہی کتنی بار یاد دہانی کر دی گئی ہے کہ جس مد میں بھی خرچ کرو گے، وہ آمدنی آئی کہاں سے ہے۔ بہر حال اللہ ہی کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ تو اس مال عطیۂ الٰہی کو اسی دنیا میں نیک کاموں میں قبل قیامت خرچ کر دو، اور قیامت کا نام بجائے صراحت سے لینے کے اس کا تعارف ان علامتوں سے کرایا ہے، کہ

(۱) اس دن کسی طرح کی سودا بازی، لین دین، خرید و فروخت نہ ہو سکے گی،

(۲) اور نہ کوئی محبت و دوستی اور قرابت داری کا رشتہ چل سکے گا،

(۳) اور نہ کسی بڑے شخص کی سعی و سفارش، اس کی وجاہت، مروت یا دباؤ کی بنا پر قابل قبول ہو گی،

لیکن نفی صراحت کے ساتھ ان تین مدوں کی کیوں؟ وجہ یہ کہ یہی تین گمراہیاں تو شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں۔ گمراہ قوم اول تو حشر و یوم حساب کی قائل کہاں تھیں؟ اور جو اہل کتاب کے اثر سے، یا خود اہل کتاب قومیں، تھوڑی بہت اس کی تھیں بھی، تو طرح طرح کی پخیں عجب عجب لگا رکھی تھیں، کہیں عقیدہ تھا کہ اہل ثروت تو وہاں بھی مالدار ہوں گے۔ اپنی بدیاں کچھ دے دلا کر دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینگے اور ان کی نیکیاں کچھ خرچ کر کے اپنی طرف منتقل کریں گے۔ اور کہیں یہ عقیدہ تھا کہ

دوستی عزیزداری کی بناپر سیہ کاریاں حسنات میں تبدیل ہو جائیں گی، اور سب سے بڑھ کر یہ عقیدہ پھیلا ہوا تھا کہ فلاں فلاں بزرگ آباواجداد مقبول و مقرب اپنی سفارش کے ذریعہ اپنی اولاد کو یا اپنے جاننے والوں کو چھڑا لائیں گے۔ یہ آخری فتنہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور دین نصرانیت کی بنیاد ہی ان دو عقیدوں پر ہے۔ ایک عقیدۂ کفارہ، جس کے معنی ہیں کہ ابن اللہ نے ساری دنیا کے گناہگاروں کی طرف سے فدیہ یا کفارہ بن کر اپنی جان سولی پر دے دی۔ اور دوسرا عقیدۂ شفاعت، جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح ابن اللہ کا مستقل منصب شافع مطلق کا ہے۔ عرش الٰہی پر متمکن یہی کئے جائیں گے اور بے دریغ شفاعت کر کے اپنے ماننے والوں کو نجات دلواتے جائیں گے۔

اسلامی شفاعت جو ہے، وہ کوئی مستقل شفاعت ہی نہیں بلکہ ایک صورت مقبولین کی دعا کی ہے۔ مقبولین حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ایماء پاکر درخواست کریں گے، دعا کریں گے کہ فلاں فلاں کے قصوروں کو، خطاؤں کو نظر انداز کر کے انھیں مغفرت سے نواز دیا جائے۔ اور یہ دعا ان لوگوں کے حق میں قبول ہو گی۔ چنانچہ اسی آیت الکرسی کے دوسرے ٹکڑے میں ہے :۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

کون ایسا ہے جو اللہ کے آگے شفاعت کر سکے، ہاں سوا اس کے کہ اسی کی اجازت سے ہو۔

یعنی شفاعت تو تمام تر حق، حق تعالیٰ ہی کا ہے لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ہاں وہی خود جس کسی کو چاہتا ہے اس کا مجاز کر دیتا ہے اور بہ ظاہر اس کی درخواست قبول کر کے اس کا اعزاز سب کی نظر میں دوبالا کر دیتا ہے۔

جاہلی اور نیم جاہلی قوموں کی گمراہیاں اگر پوری طرح نظر میں ہوں تو ان آیتوں کی قدر و قیمت اور معنویت نظر میں خوب رچ جاتی ہیں۔

(۲۹)

بزرگ آیت الکرسی اور اس کے بزرگ لمحات سے گزر کر اب آپ اس مقام پر آتے ہیں جہاں رئیس الموحدین حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا مکالمہ و مناظرہ اپنے ایک معاصر بادشاہ سے درج ذیل ہے :۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ (آیت ۲۵۸)

(اے مخاطب) کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جو ابراہیم سے ان کے پروردگار کے باب میں مباحثہ کر بیٹھا اس (شیخی) میں آ کر کہ اللہ نے اسے بادشاہت دے رکھی تھی ۔

قرآن مجید میں اس بادشاہ کا نام اور پتا نشان کچھ درج نہیں مفسرین نے اس کا نام نمرود لکھا ہے، اور وہ بادشاہ بابل یا کلدانیہ کا تھا۔ حضرت ابراہیم کے زمانے کی تاریخ بہت دھندلی ہے ۔ اس لیئے بادشاہ کا صحیح نام اور پتہ اب تک تاریخ کے صفحات میں نہیں مل سکا ہے ۔ تو یہ بات کچھ ایسے اچنبھے کی نہیں ۔ نمرود ہی خدا معلوم اس کا اصلی نام تھا یا یہ صرف اس کا عربی تلفظ ہے ۔ بہرحال اس نام کے ایک بادشاہ کا ذکر توریت میں دو جگہ آیا ہے ۔ اور دونوں جگہ سخت ظالم کی حیثیت سے ۔ ایک جگہ صحیفہ پیدائش کے باب ۱۰ کی آیت ۹ میں ہے ۔

"...... سے نمرود پیدا ہوا ۔ وہ زمین پر قہار ہونے لگا اور خداوند کے سامنے وہ قہار و جبار تھا"

اور دوسری جگہ صحیفہ ۱ ۔ تواریخ کے باب ۱ کی آیت ۱۰ میں ہے :۔

"وہ زمین پر جبار ہونے لگا"

اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں روایات یہود کے حوالے سے ہے :۔

"نمرود زمین کا بادشاہ ہوگیا، اور آزر کو اس نے اپنا وزیر بنایا، اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرود خدا سے بیگانہ ہوگیا۔ اور بہت سخت قسم کا مشرک ہوگیا" (جلد ۹ ص ۳۰۹)

اور اتنی صراحت انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس میں ملتی ہے، کہ بابل کی تاریخ میں ایک بادشاہ کا نام آتا ہے، بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا۔ اور بعض مورخین نے اسے نمرود کا بڑا اُبّت قرار دیا ہے۔

اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ میں اَنْ، لِاَنْ کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ نے جو اسے بادشاہت سے سرفراز کر دیا تھا، یہی اسے کبر و پندار پر لے آیا۔ اور اسی نے اس میں سرکشی اور طغیانی پیدا کر دی۔

اَلَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مباحثہ و مناظرہ شروع اسی نے کیا تھا نہ کہ پیغمبر وقت نے۔

فِیْ رَبِّهٖ اسے ظاہر کر رہا ہے کہ گفتگو باب الوہیت میں نہ تھی، منکر و مشرک فرماں رواؤں کو ٹھوکر باب ربوبیت ہی میں لگی ہے۔ اپنے متعلق الوہیت کا دعوٰی تو شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔ دعوے ہے بھی بدیہی البطلان۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں، کلدانیوں کا مذہب اصلاً شمس پرستی کا۔ یعنی سورج دیوتا کی پوجا کا تھا، دوسرے دیوی دیوتاؤں کا سوا رہی تھا۔ اُسی کا مظہر یا اوتار عجب نہیں کہ نمرود کلدانی اپنے کو سمجھ رہا ہو۔ اور اہل توحید کو سرکاری مذہب کا دشمن و غدار، اور ایسے خدائے باطل کو اہل توحید سے جلن اور جھنجھلاہٹ پیدا ہو جانا قدرتی تھا۔ یہود کے مؤرخ قدیم جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں ذکر ہے:۔

"لوگوں کی خوش حالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکنے لگا، گویا کہ وہ خود قادر علی الاطلاق تھا، کہتا تھا کہ اگر پھر کبھی خدا نے طوفان نوح کی طرح دنیا کو ڈبویا تو

میں اس سے انتقام لوں گا" (باب اول سیکشن ۱، پیرا ۴۔)

إِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ (آیت ۲۵۸)

جب کہ ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا خدا وہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔

یہ آپ نے یقیناً اس کے اسی سوال کے جواب میں کہا ہو گا کہ وہ کون سا خدا ہے، جس کے تم پرستار ہو؟ نمرود تو مدعی اپنے رب اور مظہر خدا ہونے کا تھا، اس نے داعی توحید کو چیلنج دے کر پوچھا ہو گا کہ وہ کون سا خدا ہے؟ جس کی طرف تم دعوت دیتے رہے ہو، ذرا اس کے اوصاف تو مجھے سناؤ ـــــ مشرک افراد آج بھی بڑے اچنبھے سے پوچھا کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں دیوی دیوتاؤں کے علاوہ، اور ان سے ماورا آخر خدا ہے کون سا؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے افعال وصفات کیا ہیں؟ کچھ اس رنگ کے سوال اُس وقت بھی ہوئے ہوں گے۔

آپ نے جواب میں فرمایا ہو گا کہ حیات وموت کی ساری قوتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں وہی ساری نظام ربوبیت کا سرچشمہ ہے، کائنات حیاتی کی بقاء و فنا کے سارے قانون اور ضابطے آخر میں اسی پر جا کر ٹھہرتے ہیں کسی ہستی میں بھی یہ طاقت نہیں کہ اس نظام بقائی و فنائی کو بدل دے۔ یا اس میں کوئی ادنیٰ سا تصرف کر دکھائے۔

علم کلام جسے ہمارے غالی صوفیا بڑی حد تک حقارت سے دیکھتے ہیں، بلکہ متکلم کو گمراہ و بد دین سمجھتے ہیں تو آپ نے دیکھ لیا کہ اُسے بد دینی کے درجہ پر رکھنا کجا، اس کا اثبات تو سُنتِ انبیاء سے ہو رہا ہے!

قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ط

وہ بولا کہ زندگی اور موت تو میں دیتا ہوں۔

بے دین کی عقل ہی کتنی! موت وحیات کے اسباب بعید و خفی کو تو اس نے چھوڑا صرف اسباب سطحی و قریبی کو سامنے رکھ کر بولا کہ سامان معیشت تو سب میرے ہاتھ میں ہے،

جسے چاہوں زندہ رہنے دوں، اور جسے چاہوں بھوکوں مار ڈالوں۔ یا اور جس طرح چاہوں اس کی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔

ابراھیم ذکی نے جب دیکھا کہ اتنی موٹی بات بھی مخاطب غبی کی سمجھ میں نہ آئی تو آپ نے ایک دوسرا پیرایہ اور زیادہ عام فہم اختیار کیا۔

قَالَ اِبْرٰهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔

ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو ذرا مغرب سے نکال کر دکھا۔

مؤحد اعظم نے استدلال کو زیادہ قریب الفہم بنانے کے لئے یہ دوسری مثال جھٹ سے پیش کر دی، کہ تو سورج دیوتا کا اوتار بنا پھرتا ہے۔ اور اسی دیوتا کے قادر و متصرف ہونے کا ڈھنڈورچی ہے تو زیادہ نہیں تو ذرا اتنا ہی کر دکھا کہ سورج عام قانون الٰہی سے ہٹ کر، کسی دن ذرا اُرخ اور سمت ہی بدل دے۔ دوسروں پر قدرت و تصرف رکھنا الگ رہا ذرا اپنے ہی اوپر تصرف کر کے دکھا دے۔ تصرف بھی صرف اتنا کہ اپنا رُخ بجائے اِدھر کے اُدھر کر دے ـــــ آپ نے نفس استدلال وہی قائم رکھا صرف مخاطب کی غباوت اور سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے گویا یہ کہہ دیا کہ اچھا کائنات حیاتی میں نہ سہی، کائنات طبعی ہی کے نظام خلائی میں ایک ادنیٰ تصرف کر کے دکھا دے۔

فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ   پس جو کافر تھا وہ مبہوت ہو گیا۔

اس کا جواب کسی مشرک، وآفتاب پرست کے پاس کیا ہو سکتا تھا۔ نہ اس وقت کسی سے جواب بن پڑا، نہ آج بھی کسی سے ممکن ہے۔ استدلال کا حاصل وخلاصہ یہ ہے کہ جس ہستی کے صاحب ارادۂ عظیم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ صاحب ارادۂ خفیف بھی ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن کسی "خدا" کے عاجز ولاجواب رہ جانے کا منظر اس سے بڑھ کر کیا پیش

ہو سکتا تھا۔

آیت کا توڑ قرآن کے عمومی اسلوب بیان کے مطابق اللہ کے ایک عام قانون کے بیان پر ہوا ہے۔

وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

اور اللہ راہ ہدایت نہیں دکھاتا ظالم لوگوں کو

اور ظالم لوگ کون ہوتے ہیں؟ وہی جو خلوِ ذہن کے ساتھ حقائق پر غور نہیں کرتے اور حقیقت رسی کی کوشش ہی ذہن سلیم و مستقیم کے ساتھ نہیں کرتے۔ بلکہ ضد و عناد، تقلید جامد و تعصب پر جمے رہتے ہیں۔ چنانچہ اب ظالم و فاجر "خدا" باوجود لاجواب ہونے کے ایمان نہ لایا اور اپنی بات کی پیچ پر قائم رہا۔

۳۰

ختم رکوع سے کچھ قبل ایک حکایت حضرت ابراھیم علیہ السلام کی اور آئی ہے اور مشکلات القرآن کے سلسلے میں سننے کے قابل ہے، ایک دن آپ کو خیال گزرا کہ حشر اجساد کیوں کر واقع ہوا، مدتوں کے مرے اور گڑے ہوئے لاشے آخر کس طرح جی اٹھیں گے۔ اور جب خیال آیا تو اپنے رب سے بھی سوال کر بیٹھے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ (آیت ۲۶۰)

(وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار (ذرا) مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا۔

سوال اس کا ہوا کہ کیا اس کا یقین نہیں؟

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ، ارشاد ہوا کہ تمہیں اس کا یقین نہیں؟

آپ تو خیر پیغمبر تھے، یقین تو ہر عامی مومن کو ہوتا ہے، آپ کو کیسے نہ ہوتا! جواب ملا

قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ — عرض کیا کہ ضرور ہے لیکن یہ درخواست اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے۔

یقین سے گزر کر درجۂ اطمینان اور سکون کا حاصل کر لینا چاہتا ہوں اور علم الیقین سے گزر کر مرتبۂ عین الیقین تک پہونچ جانا چاہتا ہوں، یقین کا جو مرتبہ تصدیق و ایمان کے لئے کافی ہے، وہ تو حاصل ہی ہے، اب اور اس سے بڑھ کر درجۂ اطمینان و مشاہدہ کی طلب ہے محققین عارفین نے کہا ہے کہ مقبولین کے مشاہدات سے ترقی ہی ان کے مراتب ایمان و کمالات ایقان میں ہوتی رہتی ہے، اور پھر اسی نسبت سے اضافہ ان کے تقرب، اعزاز، وقار میں ہوتا رہتا ہے — اللہ کے ہونے والے خلیل میں طلب اور تڑپ اسی مرتبہ کی ہوئی تھی۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ۔

ارشاد ہوا کہ اچھا چار پرندے لو اور انھیں اپنے سے خوب ہلا لو۔

آیت میں اہم ترین لفظ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ہے، لغت میں صَارَ يَصُوْرُ کا مفہوم اپنے سے خوب ہلا لینے اور مانوس کر لینے تک ہے، اور اہل تفسیر نے یہاں اتنا مضمون محذوف مانا ہے کہ اس کے بعد انھیں ذبح کر ڈالئے اور آپس میں اس کا گوشت ملا لیجئے۔ — شعر و محاضرات ادب بھی ایسے محذوفات سے نامانوس نہیں، اور قرآن خود بھی ایسے محذوفات و مقدرات سے خالی نہیں۔ سورۂ بقرہ کے ابتدائی ہی رکوعوں میں حضرت موسیٰ کو حکم ملا ہے کہ چٹان پر اپنا عصا مارو (فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ) اور پھر اس مضمون کو ظاہر کئے بغیر کہ آپ نے اس حکم کی تعمیل کی اور چٹان پر ضرب لگائی، یہ بیان آگیا ہے۔ بس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے (فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا) اور ایسی مثالیں اور بھی بہت سی مل جاتی ہیں۔ بلکہ لغت و تفسیر کے بعض اماموں نے تو یہ صاف لکھ دیا ہے کہ صَادَ يَصُوْدُ کے معنی خود ہی کاٹنے اور پارہ پارہ

کر ڈالنے کے ہیں۔ کسی حذف و تقدیر کے ماننے کی ضرورت ہی نہیں۔ بہرحال حذف مانا جائے تو، اور نہ مانا جائے تو اتنے جزو پر جمہور مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں مراد یہی ہے کہ چاروں پلے ہوئے پرندوں کو ذبح کر کے پارہ پارہ کر ڈالئے۔ بعض مفسروں نے ان چاروں پرندوں کو تعیین کر کے ان کے نام بھی لکھ دیئے ہیں۔ لیکن اول تو یہ روایت ہی کوئی مضبوط سند نہیں رکھتی۔ پھر اس تعیین کی ضرورت ہی کیا ہے۔ البتہ بعض صوفیاء نے اس روایت سے خوب کام نکالا ہے۔ اور ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ان چاروں پرندوں سے اشارہ ان کی چار قوتوں کی طرف نکلتا ہے۔ جو مشاہدۂ حق اور حیاتِ روحانی سے مانع و حاجب ہوتے ہیں، اور جن کو قربان کئے بغیر انسان پاکیزگی کی منزل تک پہونچ نہیں سکتا۔ اور وہ چار نفسیاتی قوتیں یہ ہیں :۔

(۱) خود بینی یا خود نمائی یا حُبِّ جاہ

(۲) افراطِ شہوتِ جنسی

(۳) حرص و طمع یا حُبِّ مال

(۴) طولِ اَمل یا محبّتِ دُنیا

اچھا تو پرندوں کے اس گوشت کے مخلوطہ کو ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیجئے۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا

پھر ان میں کا ایک ایک حصہ پہاڑ پر رکھ دو۔

جُزْءً کے مسئلے کو خوب سمجھ لیجئے۔ یہ مراد نہیں کہ چاروں کے مجموعہ کا ایک ایک مسلم جُزو یا ایک ایک پرندہ، بلکہ مجموعے یا مخلوطے کے ملے جلے حصے۔

ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ؕ

پھر انھیں بلاؤ تو وہ تمہاری طرف دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔

جب چند روز کے کھلانے پلانے اور اپنے سے ہلا لینے سے وہ اتنے مانوس

اور مطیع اپنے مجازی مالک کے ہو جاتے ہیں کہ اس کی ایک آواز پر دوڑے ہوئے اس کے پاس چلے آتے ہیں، تو میری ہی پیدا کی ہوئی روحیں، میرے بلاوے پر کیسی بے چون وچرا اور کیسی بے خطا میرے پاس بھاگی ہوئی نہ آجائیں گی۔ اور اس کے ایک مشاہدے نے تمھارے دل کے اندر یہ حقیقت اُتار دی ہوگی۔

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (آیت ۲۶۰)

اور اسے جانے رہو کہ اللہ زبردست ہے اور حکمت والا۔

آیت کا خاتمہ حسب معمول اس اصول پند پر ہوا ہے، کہ اسے خوب جانے بوجھے رہو کہ اللہ تو ہر ہر چیز پر یکساں غالب وقادر ہے دشوار اور محال اس کے نزدیک کیا ہے۔ اشد واسہل اس کے لئے سب برابر۔ یہ تفریقیں تو انسان کے اپنے معیار سے ہیں۔ اور باوجود اس عموم قدرت واختیار مطلق کے وہ کرتا صرف وہی ہے۔ جو عین اس کی حکمت ومصلحت کے مطابق ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تیسرا خطبہ

سورۂ آلِ عمران میں سیدہ حضرت مریمؑ کا قصہ ذرا تفصیل سے آتا ہے، اور توجہ سے سننے والا ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۚ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ (آیت ۳۵)

وہ وقت یاد کرو جب عمران کی بیوی نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میں نے نذر مانی ہے اس (بچہ) کے لئے جو میرے پیٹ میں ہے آزاد رکھا جاوے گا، سو تو یہ مجھ سے قبول کر تو خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔

عمران کے نام کی تاریخی شخصیتیں دو گذری ہیں۔ ایک حضرت موسیٰؑ کے والد ماجد عمران بن صہر، اور دوسرے ان سے صدیوں بعد، حضرت مریم کے والد ماجد اور حضرت عیسیٰ کے نانا۔ عمران بن ماثان۔ سیاق میں یہی مراد ہیں۔ امرأۃ عمران یعنی انکی بیوی، ان کا نام مسیحی نوشتوں میں حنہ (Hannah) آیا ہے اور ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ شام وغیرہ میں مسیحی کلیسا، کلیسائے حنہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور ان کی قبر شہر دمشق میں ہے۔

مُحَرَّرًا یعنی ہر قسم کے دنیوی علائق سے آزاد رہے گا۔ اور تیری ہی خدمت اور چاکری کے لیئے وقف رہے گا۔

جب سے آپ حاملہ تھیں اور اُمید فرزند نرینہ کی کر رہی تھیں تو آپ نے اسوقت یہ مناجات حق تعالیٰ سے کی تھی۔ ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کی خدمت کے لیئے اولاد ذکور کو نذر کرنے کا دستور اس وقت تھا۔ اور والدۂ مریم نے اس دستور کے مطابق یہ منت مان لی تھی ——— اس دعا سے متعلق اور بھی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں موجود تھیں۔ لیکن جب آبائے کلیسا نے کاٹ چھانٹ کرکے "مستند" انجیلیں مرتب کرنا شروع کیں تو انھوں نے ایسے بہت سے بیانات کو حذف کرکے اپنی مستند کتابوں سے خارج کر دیا۔ اور یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے مسیحی فاضل کہہ رہے ہیں۔ مثلاً کیتھولک ڈکشنری میں صے۴۲ پر اور ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائیبل جلد ۲ کے صے۲۰۸ پر۔

دُعا کے آخر میں ہے کہ تو تو خوب سُننے والا میری دعاؤں کا اور جاننے والا میری آرزوؤں کا ہے۔

لیکن ولادت جب ہوئی تو خلاف توقع بجائے لڑکے کے لڑکی کی، تو اب وہ بچاری چکر میں پڑ گئیں کہ اب کیا صورت نذر پوری کرنے اور منت اُتارنے کی ہو سکتی ہے۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ

پھر جب وہ لڑکی جنی تو یہ بولیں کہ اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی۔ تو اے اللہ میرے۔ اب کیا کروں اور اپنی نذر کیسے پوری کروں۔

اب اللہ میاں کے دوران کلام میں بی بی حنہ سے فرماتے ہیں:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ

اور اللہ تو ان سے بڑھ کر جانتا تھا کہ انھوں نے کیا جنا ہے، اور لڑکا

لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔

یعنی اللہ نے تو خوب سمجھنے کے بعد ہی لڑکی عطا کی تھی۔ اور ماں غریب کو کیا خبر ہو سکتی تھی کہ یہ لڑکی کس عظمت و منزلت کی ہو گی۔ اور پھر اس کے بطن سے پیدائش کس قسم زندِ جلیل کی ہو گی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد اب اسی دعا کا بقیہ سُنیئے:۔

وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ (آیت ۳۶)

خیر میں نے تو اس کا نام مریم رکھ لیا ہے، اور میں اس کو اور اسکی اولاد کو تیری پناہ میں شیطان رجیم سے دے رہی ہوں۔

مریم نام یہود میں چلا ہوا تھا۔ اور اس کے لفظی معنی سُریانی زبان میں بلند کے ہیں۔ (اقرب الموارد)

الفاظ دعا سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ والیوں کو کتنی فکر اپنی اولاد کے دینی و اخلاقی تحفظ کی ہوتی ہے۔ اب قصہ اس کے بعد کا ملاحظہ ہو۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ؕ

پھر ان کے پروردگار نے ان کو بوجہ احسن قبول کر لیا اور اس کو اچھا نشوونما دیا اور اس کا سرپرست زکریا کو بنا دیا۔

یعنی اللہ نے والدہ مریم کی نذر کو لڑکی کی شکل میں قبول کر لیا۔ اور یہ خدمت ہیکل سلیمانی کی ساری تاریخ میں ایک نئی بات ہوئی۔ مسیحی نوشتوں کے بموجب حضرت مریم تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے چُن لی گئیں اور بعد کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

اور آپ کا نشوونما کیا جسمانی اور کیا اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ بالغ اور سیانی ہو گئیں۔

کَفَّلَهَا زَكَرِيَّا سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ یہ سارے انتظامات خدائی تھے، زکریا کی حیثیت صرف واسطہ کی تھی۔ حضرت زکریا اسلامی عقیدہ میں اللہ کے پیمبر تھے۔ مسیحی نوشتوں میں ذکر والدۂ مریم کا تو پھر آیا ہے مگر حضرت زکریا کے ذکر سے مسیحی صحیفے تقریباً خاموش ہی ہیں۔ چاروں مستند انجیلوں میں نام صرف ایک بار آیا ہے۔ انجیل لوقا میں، وہ بھی پیمبر کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف ایک بزرگ اور راست باز کاہن کی حیثیت سے۔

"یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام ایک کاہن کا تھا۔" (لوقا۔ ۱: ۵)

آپ رشتے میں حضرت مریم کی والدہ کے بہنوئی تھے۔ یعنی ان کی والدہ کی بہن کے شوہر۔ حضرت مریم کے والد جناب عمران کی وفات ان کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔ اور ان کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں یا مجاوروں کی سرداری انہیں حضرت زکریا کے حصہ میں آئی تھی۔ حضرت مریم کی تربیت کا واسطہ بھی اللہ نے آپ ہی کو بنایا۔ حضرت یحیٰی آپ ہی کے فرزند تھے۔ جو حضرت عیسیٰ کے ہم سن تھے۔ آپ کی تاریخ وفات کہیں نظر سے نہیں گزری۔ آپ کے زمانہ کا بس اندازہ ہی ان حسابوں سے کیا جا سکتا ہے۔

حضرت سلیمانؑ ہی کی طرح حضرت مریمؑ اور حضرت زکریا بھی ایسی دو شخصیتیں ہیں، جن کی عظمت و شرف قائم رکھنے کا اہتمام قرآن ہی نے اسرائیلی تاریخ اور مسیحی نوشتوں اور عقیدوں سے کہیں زیادہ کیا ہے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا۔

جب جب زکریا ان کے پاس حجرے میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے پینے کی پاتے۔

محراب عربی میں، اردو کی محراب سے الگ، حجرے کو کہتے ہیں۔ جہاں کوئی سب سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھے اور ہیکل سلیمانی کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل کے ادھر اُدھر زاویے اور حجرے بنے ہوئے تھے۔ انھیں میں سے ایک حجرہ حضرت بی بی مریم کا تھا۔ حضرت زکریا یوں بھی سردار خدّام تھے۔ اور ہر خادم کی نگرانی آپ کے فرائض میں شامل، اور آپ پھر اس نوعمر خادمہ کے تو عزیز قریب اور بزرگ سرپرست بھی تھے۔ حجرۂ مریم میں قدرتاً آپ کی آمد و رفت رہا کرتی۔ کلّما قرآن مجید کے اس ذرا سے لفظ نے اس سارے مفہوم یعنی آپ کی کثرت آمد و رفت، اور وقت بے وقت آمد سب کی طرف اشارہ کر دیا۔ رِزْقًا سے مراد کھانے پینے کا سامان ہے۔ مثلاً تر و تازہ پھل اور میوے۔ اور امام رازی نے لکھا ہے کہ لفظ کی تنوین سے تعظیم نکلتی ہے، یعنی وہ رزق جو کوئی عجیب و غریب پہلو رکھتا تھا۔ بعض قدیم جدت پسندوں نے رزق کو استعارہ قرار دے کر اس سے مراد "فیض" لی ہے۔ اس پر ابوحیان غرناطی صاحب البحر المحیط نے لکھا ہے کہ یہ تفسیر کے حدود سے تجاوز کر کے باطنیہ کی زبان اختیار کر لینا ہے۔

یہ طور جملہ معترضہ یہ بھی سن لیجئے کہ بی بی مریم چونکہ نبی نہ تھیں، محض ولی تھیں جس سے امامیہ کو بھی اہل سنت کے ساتھ اتفاق ہے۔ اس لئے اس آیت سے محققین نے اثبات کرامت و خرق عادت پر استناد کیا ہے۔ حضرت زکریا کو اس پر حیرت ہونا بالکل قدرتی تھی اور پیمبر تک کے لئے ضروری نہیں کہ ہر معاملہ میں اپنی نظر کو اسباب ظاہر کے باہر دوڑائے۔

آپ حیرت سے سوال کر بیٹھے:۔

قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ

"پوچھ بیٹھے کہ اے مریم یہ (سب) تجھے کہاں سے مل جاتا ہے"؟

لاتا تو میں ہی لاتا۔ میرے سوا کون یہ چیزیں پہنچا دیتا ہے؟

قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ

بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (آیت ۳۷)

بولیں کہ یہ اللہ کی طرف سے (آجاتے ہیں) اور بیشک اللہ جس کو چاہے،

اسے رزق بے حساب دے دیتا ہے۔

عارفہ کی نظر اسباب پر نہیں مُسبب الاسباب پر تھی۔ اس نے وہی جواب میں کہہ دیا اور اس پر اضافہ بھی اس نکتۂ عارفانہ کا کر دیا کہ اللہ کی مشیت کسی واسطہ اور کسی حق و استحقاق کے ساتھ مقید نہیں۔ وہ جب کسی کو دینے پر آئے تو بلا واسطہ اسباب بھی دے سکتا ہے اور بلا استحقاق بھی۔

ضمناً اس میں رد نکل آیا ان مشرک قوموں کا جنھوں نے خوش حالی اور تنگ حالی کو لازمی نتیجہ قرار دیا ہے پچھلے جنم کے اعمال کا۔ اسلام کا خدا جس طرح اپنی مشیت تکوینی کے ہر جزو میں آزاد ہے۔ اسی طرح تقسیم رزق میں بھی۔

آگے سنیئے :۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ

بس وہیں زکریا اپنے رب سے دعا کرنے لگے۔

قدرت ورحمت الٰہی کے تازہ کرشموں سے حضرت زکریا کا تاثر قدرتی تھا۔

ھُنَا ظرف مکان، ظرف زمان کے معنی میں آیا ہے۔ اس لئے دوسرا ترجمہ بجائے "وہیں" کے "معاً" بھی ہو سکتا ہے۔ غرض جوں ہی آپ پر منکشف ہوا کہ یہ مقام قبولیت کا، اور خرق عادت کے صدور کا ہے، آپ خود بھی مصروف دعا ہو گئے۔

قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ (آیت ۳۸)

عرض کی کہ اے میرے پروردگار اپنے پاس سے ایک پاکیزہ اولاد دے بے شک تو دعا کا بڑا سننے والا ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً یعنی اولاد پاکیزہ جو میرے سلسلۂ روحانی کو آگے چلا سکے۔ مجھے بھی اولاد صالح اسی طرح عنایت ہو جس طرح والدہ مریم کو مریم عنایت ہو چکی ہیں، حضرت زکریا کبر سنی کو پہونچ چکے تھے، اور بیوی صاحبہ بھی عقیم یا بانجھ سمجھ لی گئی تھیں۔ ایک خارق عادت واقعہ کو دیکھ، آپ کا ذہن قدرتاً اس طرف منتقل ہوا کہ جو خدا اس پر قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری تر و تازہ پھل پھلاری پہنچا دے، وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ اس سن میں مجھے نعمت اولاد سے سرفراز کر دے۔

مِنْ لَّدُنْكَ یہ جزو اسے صاف کر رہا ہے کہ دعا مانگنے والے کی نظر اس دنیا میں بھی اسباب سے بڑھ کر خالق اسباب پر ہے۔

قدرتاً اولاد کی خواہش امر طبعی ہے اور زہد گیا معنی کمال زہد کے بھی منافی نہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کی دعائیں پیمبروں کی زبان سے ادا کرا کے یہ بتا دیا کہ جن مذہبوں نے بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے، وہ حقیقت سے کس قدر دور ہیں۔ طلب اولاد کی دعا تو سنت انبیا و صدیقین ہے، اور صحیح بخاری میں ایک مستقل باب طلب اولاد کے فضائل میں ہے۔

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً کے اضافہ نے صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر آخرت پر بہر حال رہتی ہے۔ کوئی مضائقہ اولاد کی مطلق خواہش میں بھی نہ تھا، لیکن حضرت زکریا اپنے لئے محض اولاد ہی نہیں چاہتے، اولاد طیب و پاکیزہ چاہتے ہیں جو ان کے بعد دین حق کی تبلیغ کا مشن جاری رکھے۔ اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی و روحانی

فضائل بہرحال مقدم رہتے ہیں۔ انجیل میں بجائے اس دلآویز، مؤثر، روح پرور تفصیل کے قناعت صرف اس خشک، مختصر واقعاتی بیان پر کی گئی ہے

"زکریا نام کا ایک کاہن تھا، اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی اور اس کا نام الیشبع تھا اور ان کے اولاد نہ تھی، اس لئے کہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے" (لوقا۔ ۱: ۵۔۷)

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الدُّعَآءِ تو دعاؤں کا بڑا سننے والا اور بڑا قبول کرنے والا ہے۔ حق تعالیٰ کی اس صفت کو بار بار بیان میں لانا ان مادی اور نیچری عقیدہ والوں کے رد میں ہے، جو واقعات کو تمام تر اسباب ظاہری و مادی ہی کا نتیجہ سمجھتے اور ارادہ حق تعالیٰ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے۔ دعا معاً قبول ہو گئی اور حالت نماز ہی میں فرزند کی بشارت مل گئی۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى (آیت ۳۹)

انھیں فرشتوں نے آواز دی اور وہ ابھی نماز حجرہ میں کھڑے ہوئے پڑھ رہے تھے کہ اللہ تم کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔

اَلْمَلٰٓئِكَةُ کا صیغہ جمع کھٹک نہ پیدا کرے۔ یہ لازمی نہیں کہ آواز دینے والے فرشتے متعدد ہوں۔ عربی میں صیغہ جمع اسم جنس کا بھی کام دیتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ملائکہ سے مراد صرف جنس ملائکہ ہی ہو، اور عربی میں یہ محاورہ عام ہے۔ فلان یرکب الخیل (فلاں شخص گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے) حالانکہ وہاں مراد گھوڑے کی جنس ہوتی ہے نہ کہ ان کا تعدد۔

یحییٰ۔ فرزند کی صرف بشارت ہی نہیں ملی، بلکہ نام بھی عطا ہو گیا۔ انجیل میں تلفظ یوحنا آیا ہے۔ اس خاص موقع پر عبارت ہے :-

"فرشتے نے اس سے کہا اے زکریا خوف نہ کر، کیونکہ تیری دعا سُنی گئی۔
اور تیری بیوی الیشبع تیرے لئے بیٹا جنے گی، اس کا نام یوحنا رکھنا، اور تجھے
خوشی و خرمی ہوگی" (لوقا۔ ۱: ۱۴)

یہ حضرت عیسیٰ کے خالہ زاد بھائی تھے اور حسب روایت انجیل، ان سے سن میں عمر ف چھ مہینے بڑے، ۳۰ء میں حاکم شام و فلسطین ہیرود کے حکم سے شہید کر دیئے گئے۔ یحییٰ کا صرف نام ہی نہیں عنایت ہوا۔ بلکہ کچھ اوصاف کی بھی پیش خبری دی گئی۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا
وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (آیت ۳۹)

کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا اور بڑے نفس کے ضبط
کرنے والے اور نبی صالحین میں سے۔

ان الفاظ کو خوب سمجھ لیجیئے۔ جس طرح روح القدس ایک لقب حضرت جبرئیل کا ہے
كَلِمَةٍ مِّنَ اللهِ سے مراد حضرت مسیح ہیں۔ ابن عباس صحابی اور متعدد جلیل القدر تابعین سے یہی منقول ہے۔ یعنی تصدیق حضرت عیسیٰ کی کرنے والے۔ اور مسیحی عقیدہ میں حضرت یحییٰ کی اصل حیثیت مسیح کے نقیب الٰہی کی ہے۔

سَيِّدًا یعنی دین کے باب میں مقتدا اور پیشوا۔ عیسائی تو خیر آپ کی بزرگی کے قائل ہی ہیں۔ یہودی بھی باوجود آپ سے بدعقیدگی اور دشمنی کے، آپ کی مرجعیت اور مقبولیت کے منکر نہیں۔

حَصُوْرًا یعنی اسے اپنے شہوات اور جذبات پر قابو حاصل ہوگا اور وہ نہایت درجہ محتاط و متقی ہوگا۔ انجیل میں آپ کے زہد و عفاف کا ذکر مختلف موقعوں پر صراحت و تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً"

"خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا، ہرگز نہ وہ مے اور نہ کوئی اور شراب

پیئے گا۔ اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے وہ روح القدس سے بھر جائے گا" (لوقا۔ ۱: ۱۶)
اور اسی انجیل لوقا میں آگے چل کر ہے :۔

"اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو ان کا خدا ہے پھیرے گا اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راست بازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لئے ایک مستعد قوم تیار کرے۔" (لوقا۔ ۱: ۱۷، ۱۸)

اوپر اسی لوقا میں ہے:

"اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا، اور اسرائیل پر ظاہر ہونے تک جنگلوں میں رہا۔" (لوقا۔ ۱: ۸۰)

نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ یہ ذرا سا فقرہ دو چیزوں کا اثبات کرتا ہے: ایک آپ کی نبوت کا، یہ رد ہے یہود کا جو آپ کو بجائے نبی کے ایک بنا ہوا انقلابی سمجھتے تھے۔ دوسرا آپ کی صالحیت کا اثبات، نصرانیوں کے مقابلہ میں ہے۔ صالحیت تو نبوت سے ہلکی اور پست چیز ہے۔ اور جب کوئی نبی ہے تو آپ کہیں گے کہ ظاہر ہے کہ وہ صالح تو ہوگا ہی۔ لیکن یہ ظاہر کہاں ہے؟ یہ تو صرف اسلام کی تعلیم ہے، اسلام ہی نے آکر یہ سبق سکھایا، ورنہ اہل کتاب کے ہاں تو تقویٰ لازمۂ نبوت تھا ہی نہیں۔ اور نبی کوئی غیر صالح بھی ہو سکتا تھا۔

حضرت زکریا کو بشارت تو بیٹے کی مل گئی اور اپنی دعا کی بھرپور مقبولیت پر آپ کو جیسی مسرت ہوئی ہوگی، ظاہر ہے، پھر بھی آپ بشر ہی تھے اور بشریت کے تقاضے سے حیرت میں بھی تھے کہ قدرت کے معمولات عام سے اس قدر ہٹ کر کوئی واقعہ واقع ہوگا کیونکر۔ یہ شبہ بھی بے تکلف جناب باری میں پیش کر دیا۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ط

عرض کی کہ اے میرے پروردگار میرے بیٹے کس طرح ہو گا۔ اس حال
میں کہ مجھے کبر سنی نے آلیا ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔

آیت یہ تعلیم بھی دے رہی ہے کہ خلاف اسباب مادی کسی شے کی خبر وقوع پر
حیرت جس طرح ہر بشر کے لئے ایک امر طبعی ہے، خود پیمبر بھی امور طبعی میں بالکل بشر ہی ہوتے
ہیں۔ اس لئے ان کے لئے بھی بالکل جائز ہے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ○

اللہ اسی طرح کر دیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے۔

رفع استبعاد کے لئے بس استحضار قدرت الٰہی کا یہ مراقبہ بالکل کافی ہے اور پیمبر کو
اس استحضار کے لئے ایک اشارہ کافی ہو گیا۔ اب عرض کی کہ اس کے لئے کوئی خاص نشان
بھی ارشاد ہو جائے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَل لِّيْ آيَةً ○ (آیت ۴۱)

بولے اے پروردگار میرے لئے کوئی نشان مقرر کر دے۔

یعنی کوئی ایسی علامت اعجازی رنگ میں ظاہر ہو جائے جس سے متعین طور پر مجھے
یقین ہو جائے کہ حمل قرار پا گیا اور زمانہ ولادت اب قریب ہے۔

قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ط
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ○ (آیت ۴۱)

ارشاد ہوا کہ نشانی تمہارے لئے یہ ہے کہ تم بات چیت نہ کر سکو گے لوگوں سے
تین دن تک بجز اشارات کے، باقی اپنے پروردگار کو بہ کثرت یاد کرتے
رہو اور اس کی تسبیح بھی دن میں بھی اور شام میں بھی۔

یعنی وہ نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تم لوگوں سے بات چیت نہ کر سکو گے باقی اپنے پروردگار

کی یاد خوب کرتے رہو۔ اور اسکی تسبیح بھی صبح وشام کرتے رہو۔ اور محاورۂ زبان میں اس سے انھیں دو وقتوں کی تعیین اور حصر مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ دوام ذکر و تسبیح ہی مراد ہوتا ہے۔

قرآن مجید جو تمام آسمانی صحیفوں پر مہیمن یعنی نگراں و نگہبان ہے۔ اس کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ ان غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا جائے۔ اس نے اپنا فرض یہاں بھی انجام دیا۔ ورنہ انجیل کے بیان سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی لغزش و معصیت حضرت زکریا سے سرزد ہو گئی تھی۔ اور اس کی سزا یہ ملی تھی کہ چند روز کے لئے آپ کی قوتِ گویائی سلب کر لی گئی تھی۔ چنانچہ انجیل کی عبارت اس موقع پر ہے:-

"اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ بس انھوں نے معلوم کر لیا کہ اس نے مقدس رویا دیکھا ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور گونگا بنا رہا (لوقا۔ ۱: ۲۱)

غرض یہ کہ یہ تین دن کی خاموشی بہ طور سزا یا عذاب کے تھی۔ ہرگز صحیح نہیں۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ بلکہ گفتگو اس میں البتہ چل سکتی ہے کہ یہ سہ روزہ خاموشی آیا تمام تر اضطراری تھی یا اختیاری۔ یہ جمہور مفسرین کے اتباع میں ہے جو کہ آیت کے ترجمہ میں ابھی یہ عرض کیا گیا ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کر سکو گے، ورنہ الفاظ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ کا صاف سیدھا اور بے تکلف ترجمہ تو یہ ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کرو گے (نہ کر سکو گے) مفسرین میں خال خال کوئی اس طرف بھی گیا ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں اس کو ابو مسلم معتزلی کے حوالہ سے نقل کیا ہے اور خود اس کی کوئی تردید نہیں کی ہے۔

گویا حکم الٰہی یہ مل رہا ہے کہ زکریا تم تین دن تک گفتگو میں تو زبان بند رکھنا۔ ہاں ذکر الٰہی و تسبیح کثرت سے کئے جانا الا تکلم الناس میں الناس گویا فقرے کی جان ہے۔ یعنی خلق پر گفتگو کی قدرت نہ رہے۔ باقی ذکر الٰہی کے لئے زبان بدستور چلتی رہے گی۔

ــــــــ:رکوع ۳۲ :ــــــــ

حضرت زکریا کا تذکرہ درمیان میں آ جانے کے بعد اب پھر ذکر مریم شروع ہوتا ہے

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (آیت ۴۲)

اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریم اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک کیا ہے اور آپ کو دنیا جہاں کے مقابل میں برگزیدہ کیا ہے

مَلٰٓئِکَۃُ کے صیغہ جمع سے، جیسا اگلی چند سطر عرض کیا جا چکا ہے یہ لازم نہیں آتا کہ کہنے والے کئی فرشتے ہوں، صیغہ جمع اسم جنس کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے۔ رہی فرشتوں کی ہم کلامی کسی غیر نبی سے، تو وہ تو ثابت اس آیت سے ہو جاتی ہے البتہ محققین نے لکھا ہے کہ فرشتے کا اللہ کی طرف سے پیام تبلیغ صرف نبی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ اس اصطفا کا تعلق مریم کے بچپن سے ہے۔ یعنی اللہ نے برگزیدگی تو آپ کو شروع ہی سے دے رکھی ہے۔ آپ وجود میں آئیں تو اپنی والدہ کی مقبول دعاؤں کے اثر سے۔ پھر آپ سے کام ہیکل کی خدمت کا لیا گیا۔ جو اب تک مخصوص رہا تھا مردوں اور لڑکوں کے ساتھ، اور آپ کو آپ کے حجرے میں غذائیں جس اعجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اس نے زکریا پیغمبر تک کو متحیر کر دیا۔ یہ سب مثالیں آپ کی مقبولیت ہی کی تو ہیں۔

وَطَھَّرَکِ، یعنی اللہ نے آپ کو بنی نہ ہونے کے باوجود گناہوں کی آلائش سے پاک کر دیا ہے اور آپ کو اخلاقی پاکیزگی کا ایک نمونہ بنا دیا ہے ـــــــ یہ سب رد میں ہے یہود کے جو گندے الزامات آپ پر لگانے کے مرتکب ہوئے تھے۔

وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اس دوسرے اصطفار کا تعلق

آپ کے بلوغ کے بعد سے ہے۔ اور پیدائش کے بعد یہ دوسری برگزیدگی خاص خاص حیثیتوں سے ہے۔

اور ان آیتوں کے بعد پھر وہی مضمون شروع ہوتا ہے:

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْھًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ (آیت ۴۵)

اور وہ وقت یاد کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ آپ کو خوشخبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی۔ ان کا نام ولقب مسیح ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں مقربوں میں سے۔

مسیح پیمبر کے ذکر میں یہود و عیسائیوں دونوں کے رد کس خوبی کے ساتھ ساتھ نکلتے آتے ہیں۔ ابن مریم کہہ کر قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کردی کہ حضرت عیسیٰ خود تو بشر تھے ہی۔ فرزند بھی کسی دیوی دیوتا، کسی مافوق البشر کے نہ تھے، محض ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اس ابن مریم سے اشارہ اس طرف ہوگیا کہ دنیا کے عام دستور کے خلاف حضرت عیسیٰ کا انتساب، بجائے باپ کے ماں کی جانب ہوگیا۔ اور اس سے کچھ نہ کچھ روشنی آپ کی خرق عادت ولادت پر بھی پڑگئی۔

وَجِیْھًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ۔ یہ بات یہود کے رد میں ہے کہ تم نے جس کے حق میں ہر طرح کی توہین روا رکھی ہے وہ کتنی عزت و اکرام والا ہے۔ دنیا کا اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ عیسائیوں کے خالیانہ عقیدے کو چھوڑ کر خود مسلمان جو دنیا میں ۴۰، ۵۰ کروڑ کی تعداد میں ہیں، ان کو اپنا ایک سردار اور اللہ کا پیمبر برحق مان رہے ہیں اور ان کا نام بغیر علیہ السلام کے نہیں لیتے اور خود یہود بھی کچھ کم نہیں کہ اب یہود تک کے لہجہ میں نرمی آگئی ہے۔ اور صدیوں کی عداوت و عناد کے بعد اب کسی درجہ میں ان کے اجلال و اکرام کا اعتراف

انھیں بھی کرنا پڑ گیا ہے۔

مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۔ ایک لفظ میں یہود اور نصرانیوں دونوں کا رد نکل آیا پہلا رد نصرانیت کا یعنی وہ اللہ کے مقرب اور برگزیدہ بندے ہیں نہ کہ خود خدا۔ دوسرا رد یہود کا کہ وہ کوئی شعبدہ باز یا ساحر نہ تھے۔ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ کی ترکیب یہ ظاہر کیے دیتی ہے کہ وہ مقبولیت میں منفرد نہیں، بلکہ ایک جماعت ان کے شریک ہے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آیت ۴۶)

اور گفتگو کریں گے لوگوں سے گہوارے میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے۔

فِي الْمَهْدِ مراد کم عمری کا سن ہے، مفسرین نے آپ کے بچپن کا زمانہ مراد لیا ہے بچپن ہی سے آپ کی باتیں قصہ کہانی کی نہیں، بلکہ حکمت دینی و روحانی کی ہوتی تھیں انجیل لوقا کے باب ۲ میں متعدد قول حکمت و دانائی کے آپ کی زبان سے نکلے ہوئے جمع کر دیے ہیں۔ جو آپ سے بارہ سال کی عمر میں صادر ہوئے تھے۔ اور كَهْلًا سے مراد ہے پختہ عمری۔ یعنی نوجوانی کے بعد اور بڑھاپے سے قبل کا سن۔ مثلاً تیس سال سے لے کر پچاس سال کی عمر۔ مقصد یہ ہے کہ آپ میں جوش تبلیغ شروع سے آخر تک برابر بھرا رہا۔ اور عمر کے گزرنے کے ذکر میں اشارہ آپ کی الوہیت کی رد کا بھی نکل آیا۔ یعنی آپ کا جسمانی نشو و نما اسی طرح ہوتا رہا۔ جیسے ہر انسان کا ہوتا ہے۔

وَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ جب آپ نبی تھے تو اسلامی نقطۂ نظر سے کھلی ہوئی بات ہے کہ صالح کیسے نہ ہوتے۔ لیکن قرآن کا مقصود یہاں بھی اپنے معمول کے مطابق یہودیت اور نصرانیت کا دو طرفہ رد رکھا ہے۔ یہود کو اس نے یہ بتایا کہ آپ نعوذ باللہ شعبدہ باز یا ساحر نہ تھے، جیسا کہ انھوں نے افترا کر رکھا ہے۔ اور دوسری طرف نصرانیوں کو یہ بتایا ہے کہ وہ معبود یا نیم معبود نہ تھے۔

آپ بہرحال دوسرے انبیاء صالحین کی طرح بشر تھے نہ کہ فوق البشر یا دیوتا۔

جب فرشتہ کی یہ صدائے غیب حضرت مریم کے کان میں پڑی تو آپ نے حیرت کے ساتھ اپنے پروردگار سے مناجات کی :-

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ

بولیں اے میرے پروردگار میرے اولاد کس طرح ہوگی دراں حالیکہ مجھے کسی مرد نے (بغرض مواصلت) ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔

حسب روایت انجیل حضرت مریم کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی اور قبل رخصتی خلوت یہود کے قانون مروج میں بالکل ممنوع تھی۔

قَالَتْ رَبِّ "رب" بہ ظاہر بالکل معمولی اور ناقابل التفات سا لفظ ہے لیکن انجیل میں یہی مقام کھول کر دیکھ لیجیے، لکھا ہے کہ:

"ہم نے فرشتہ سے کہا" (لوقا۔ ۱: ۳۴) اس ذرا سے فرق سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن نے آپ کا مرتبۂ معرفتِ توحید کس درجہ اونچا کر دیا ہے!

اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ ۔ سوال ظاہر ہے کہ واقعہ کی حیرت انگیزی اور غرابت کی بنا پر تھا نہ کہ کسی شک و انکار کی بنا پر۔

فرشتہ سے یہ دو بہ دو گفتگو سُن لینے کے بعد انکار کا کوئی محل ہی باقی نہیں رہا تھا۔ استبعاد البتہ باقی تھا، جو لازمۂ بشریت تھا۔ اور حضرت زکریا کی جو حکایت بشارت فرزند کے وقت کی بیان ہو چکی۔ اس سے یہ حکایت کتنی ملتی ہوئی ہے

جواب بھی اسی رنگ کا ارشاد ہوا۔

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ○ (آیت ۴۷)

فرمایا ایسے ہی اللہ پیدا کر دیتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے، وہ جب کسی بات کو

پورا کرنا چاہتا ہے، تو بس اس سے کہتا ہے ہو جاؤ۔ بس اور وہ ہو جاتی ہے۔

رفع استبعاد کے لئے حضرت مریم کو یاد دلایا گیا کہ فاعل حقیقی تو ہماری مشیت اور ہمارا ارادہ ہے، نہ کہ اسبابِ طبعی و مادی و عادی، کہ وہ تو سب کے سب بس درجۂ واسطہ و وسیلہ میں ہیں۔ تو نظر صرف ہم ہی پر رکھو۔

یاد کر لیجئے کہ ایسے ہی موقع پر حضرت زکریا سے جو فرمایا گیا تھا۔ اس کے الفاظ تھے۔ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ، وہاں یَفْعَلُ اور یہاں یَخْلُقُ کا استعمال کیا محض اتفاقی ہے؟ جواب میں دو باریک بین مفسروں، ایک ابو حیان غرناطی صاحب البحر المحیط اور دوسرے صاحب روح المعانی آلوسی بغدادی نے لکھا ہے کہ حضرت زکریا کی اولاد کے معاملہ میں معاملہ کچھ ایسا غیر معمولی نہیں ہو رہا تھا۔ ولادت عام سنت الٰہی کے مطابق، یعنی مرد و زن کے اتصال سے ہو رہی تھی۔ دونوں صرف سن سے اترے ہوئے تھے۔ اس ندرت کے اظہار کے لئے یَفْعَلُ بالکل کافی ہو گیا۔ یہاں حضرت مریم کے معاملہ میں عام و جاری سنتِ الٰہی سے ہٹ کر بغیر مرد و عورت کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق کرانا تھا۔ اس لئے یہاں اس کی صفت تخلیق لائی گئی، جو اللہ کی قوت ایجاد و ابداع پر صاف دلالت کر رہی ہے۔

اور انھیں مطالب کو شیخ رشید رضا مصری صاحب المنار نے اور زیادہ بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ "جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو بس ادھر اس سے کہا کہ ہو جا اور ادھر وہ ہو گئی"۔ اللہ کیا کسی سامان کا محتاج ہے۔ اس قسم کی آیتیں برابر ان فلسفیوں اور باطل مذہبوں کے رد میں ہیں۔ جو قدیم کو حادث پر قیاس کر کے قدیم کو بھی سلسلۂ اسباب کا پابند سمجھے ہوئے ہیں۔

لَهٗ۔ ہندوستان کے ایک بے مغز غیر مسلم مذہبی لیڈر نے ایک سوال یہ اٹھایا تھا

کہ جب کوئی شے موجود ہی نہیں ہے تو یہ کہا کس سے جاتا ہے؟ اس کا کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں تو موجود ہوتی ہی ہے۔ بس اُسی کو حکم ملتا ہے کہ عالمِ عنصری میں بھی موجود ہو جا۔ اور قول کُن سے بھی مراد اس دو حرفی لفظ کا تلفظ نہیں، اس لئے کہ یہ حروف تو خود ہی حادث ہیں۔ مراد اللہ تعالیٰ کا قول اس کیفیت کے ساتھ ہے، جو اس کی شان کمال کے لائق ہے اور اور جس طرح اس کی دوسری تمام صفات کی تفصیلات ادراکِ بشری کی گرفت سے باہر ہیں۔ اس کے اس قول کی بھی کیفیت تفصیل کے ساتھ نہیں سمجھائی جا سکتی۔ مراد صرف یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی اور اس کی تعمیل کے درمیان کوئی بھی شے حائل یا حاجب نہیں بن سکتی۔

لمبا چوڑا جملہ معترضہ ختم ہوا۔ اب پھر اصل موضوع پر آئیے اور وہ مولود جو جناب مریم کو عنایت ہوگا، وہ ہوگا کس صفت کا؟

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (آیت ۴۸)

اللہ اسے سکھا دے گا کتاب اور حکمت اور توراۃ و انجیل۔

ان کلمات سے حضرت مسیح کے جس مقامِ عظمت کا اظہار مقصود ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود حضرت مریم کی بھی تشفیٔ خاطر کا کتنا سامان ہوا جا رہا ہے! ارشاد گویا یہ ہوا جا رہا ہے کہ تم غمگین و پریشان نہ ہو، بے شوہری اولاد کی بنا پر خلق تمھیں جتنا بھی مطعون و رسوا کرے گی اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمھیں کس پایہ کی عطا ہو رہی ہے؟

اَلْكِتٰبَ، بہ طور اسم جنس تمام آسمانی کتابوں کے لئے آیا ہے اور اَلْحِكْمَةَ سے مراد تمام دینی علوم و معارف ہیں جو پیمبر صاحبِ کتاب کو علاوہ اس کی مخصوص کتاب کے اس کی شرح و تتمیم کے طور پر عطا ہوتے ہیں۔ اور ابھی آگے سنیے:

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۬ — اور وہ پیمبر ہوگا بنی اسرائیل کے لئے۔

آپ کا صحیح اور اصلی مرتبہ پیمبر کا ہوگا نہ کہ آپ نعوذ باللہ ساحر و شعبدہ باز ہوں گے۔ جیسا کہ یہود نے گڑھ لیا ہے۔ اور نہ خدا یا فرزندِ خدا، جیسا کہ نصرانیوں نے فرض کر لیا اور

ہر پیمبر جس طرح اس وقت تک اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوتا رہا تھا، آپ بھی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوں گے —— اور آگے آپ کی زندگی کا مشن اور آپ کے فضائل و کمالات آپ ہی کی زبان سے بیان کرا دیے ہیں۔

أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ (آیت ۴۹)

اور وہ کہے گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں، تمہارے لئے مٹی سے پرند کی مانند صورت بنا دیتا ہوں۔ تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے، میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں۔ اور میں اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ تمہیں بتلا دیتا ہوں بے شک اس (سب) میں تمہارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

لفظ آیَۃً (نشانی) یہاں معجزہ کے مفہوم میں ہے۔ معجزہ ہر اُس واقعہ کا نام ہے جو عام اور متعارف سلسلۂ اسباب سے الگ کسی پیمبر کی تائید یا شہادت میں واقع ہوتا ہے۔ فاعل اس کا تمام تر حق تعالےٰ ہی ہوتا ہے، جو ہر واقعہ موافق و معمول حسب دستور عام ہی کا ہوتا ہے۔

مِنْ رَّبِّكُمْ (تمہارے پروردگار کی طرف سے) یہ اضافہ اس کی تاکید اور اس حقیقت پر زور دینے کے لئے ہے کہ معجزہ کا ظہور حق تعالیٰ ہی طرف سے ہوتا ہے۔

نہ کہ پیغمبر کے اختیار و قدرت سے ۔ اَخْلُقُ کے ذیل میں یہ سمجھ لیجئے کہ فعل خلق کی نسبت جب انسان کی جانب ہوتی ہے ، تو مراد کسی فعل کے اندازہ کرنے اور ایک خاص انداز سے اس کے درست رہنے کی ہوتی ہے ۔ حضرت عیسیٰ کی زندگی معجزات کے لئے مشہور رہی ہے عوام بجائے دلائل و شواہد عقلی کے ہمیشہ معجزات و خوارق ہی سے متاثر ہوتے ہیں ۔ اور یہودی تو اپنی اعجوبہ پسندی اور طلب خوارق میں کچھ اور بڑھے ہی ہوئے تھے ۔

كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ یعنی پرندوں کی شکل کے کھلونے مٹی سے بنا دیتا ہوں ۔

فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًا ۔ یعنی میرے نفخ دم سے ان میں جان پڑ جاتی ہے ۔

اس معجزہ کا ذکر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں کی چاروں مستند انجیلوں میں تو نہیں ہے البتہ قبطی کلیسا (coptic church) کی جو مستند انجیل ہے ، اس میں یہ صاف مذکور ہے ، جیسا کہ ڈاکٹر بج (Budge) نے اپنی کتاب (The Legends of our Lady Mary) کے مقدمہ ص ۲۹ پر نقل کیا ہے ۔

" وہ پرندوں کی شکل کے جانور بنا دیتے تھے ، جو اڑ سکتے تھے "

بِاِذْنِ اللّٰہِ اور یہ جو کچھ بھی ہوتا ہے میرے ارادہ و تصرف سے نہیں ، بس اللہ کے حکم و اختیار سے ہوتا ہے ۔

اَلْاَكْمَهَ ، اندھوں کو بینا کر دینے کا ذکر انجیل میں متعدد مقامات پر ہے ، مثلاً انجیل متی کے باب ۹ کے آیات ۲۷ ، و ۳۰ میں ہے ۔ اور انجیل مرقس کے باب ۸ آیات ۲۲ تا ۲۵ میں اور سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا کے باب ۹ کے آیات ۱ تا ۷ ، میں ہے ۔ اور ان میں تصریح اندھے مادر زاد ہونے کی بھی ہے ۔

اَلْاَبْرَصَ ، کوڑھیوں کا بھی ذکر انجیل میں دو جگہ ہے ۔ انجیل متی باب ۸ آیات ۱ تا ۲ میں ایک کوڑھی کی شفایابی کا اور انجیل لوقا باب ۱۷ کی آیات ۱۱ تا ۱۹ تک میں دس کوڑھیوں کے بالکل اچھے ہونے کا ۔

اُحْیِ الْمَوْتیٰ۔ اب رہا معجزہ احیاء اموات تو برنا باس میں تو اس کی تصریح ہی موجود ہے کہ ص ۴۳۷ و ص ۴۴۱ انگریزی ایڈیشن مطبوعہ آکسفورڈ۔ باقی وہ انجیلیں جو نصرانیوں کو مسلّم ہیں وہ بھی اس کے حوالوں سے خالی نہیں۔ مثلاً انجیل لوقا باب ۷، آیات ۱۱ تا ۱۶ نیز آیت ۲۲۔ انجیل متی باب ۹، آیات ۱۸۔ ۲۵ اور انجیل یوحنا باب ۱۱۔ آیات ۱۔ ۴۴۔

تاکید اور تصریح کے لئے بِاِذْنِ اللّٰهِ مکرر آیا ہے، کہ کہیں ان خوارق و تصرفات کو میری جانب نہ منسوب کر دینا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا محض حق تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ ہے۔ اور آخر میں جو ذکر آپ نے لوگوں کی ذخیرہ کی ہوئی چیزوں کی اطلاع دہی کا کیا ہے، وہ ایک مثال اور نمونہ ہے اس حقیقت کا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مخفی چیزوں پر مجھے بھی مطلع کر دیتا ہے آپ سے خوارق و عجائب کا صدور اس کثرت سے ہوا کہ انھیں کو دیکھ کر یہود نے آپ کو شعبدہ باز کہنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ آپ کا ذکر پہلی صدی عیسوی کے جوزیفس کی کتاب تاریخ آثار یہود (History of Jewish Antiquities) میں اسی حیثیت سے آیا ہے۔ بلکہ اس وقت تک بھی جیوش انسائیکلوپیڈیا کی جلد ۷ کے ص ۱۶۷ پر یوں لکھا چلا آتا ہے۔

"یسوع نے بحیثیت معلم دین یا قانون ساز کے نہیں، بلکہ بحیثیت شعبدہ باز کے اپنی زندگی میں شہرت و ناموری گلیل کے سادہ مزاج باشندوں سے حاصل کی"۔

نیا نبی یا پرانے نبی کی تردید و تغلیط کے لئے نہیں آتا بلکہ ہر جدید پیامبر پرانے پیامبر کی تجدید و تکمیل و تصدیق ہی کے لئے ہوتا ہے اور یہی بات آپ بھی فرما رہے ہیں کہ میں اپنی پیش رو کتاب توریت کی تصدیق کے لئے آیا ہوں"۔

قانونی جزئیات اور فقہی فروع میں تسہیل و ترمیم، عمومی تصدیق و تائید کے ذرا بھی منافی نہیں۔ حضرت مسیح کی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارے حبر دن اور ربیوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں خلط ملط کر دیئے ہیں میں اس سارے بوجھ کو

تم سے دور کرنے آیا ہوں۔

یہ ساری پیش خبریاں مسیح کی زندگی میں پوری ہوتی چلی گئیں۔ ان آیتوں کے بعد مسیح کی زندگی کے اصل واقعات شروع ہوتے ہیں۔ جب مسیح کی زندگی میں بجز تھوڑے سے حواریوں (ماہی گیروں) کے اور کوئی ان پر ایمان نہ لایا۔ بلکہ ان کی تکذیب و تحقیر ہی پر مصر رہے تو اس وقت کا منظر ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ج

جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے انکار ہی پایا، تو بولے میرا کون مددگار ہوگا اللہ کے لئے تو حواری بولے کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔

یعنی جب مسیح اپنی ساری سعی و تبلیغ کے باوجود یہود کے عمومی رویہ سے سخت دکھ اٹھاتے رہے اور ان کی طرف سے انکار ہی تمرد و طغیان کے ساتھ پاتے چلے گئے، تو قوم کو نصرت دین کے لئے آواز دی۔ اس پر حواری بولے کہ ہم حاضر ہیں۔

لفظ حواری پہلی دفعہ آیا ہے، تو اس کا مفہوم بھی سمجھتے چلیے۔

لفظی معنی کپڑے کو دھونے اور اسے اجلا اور صاف کر دینے والے کے ہیں۔ اور حضرت کے ابتدائی ماننے والے سمندر کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر ہی تھے۔ اس لئے اس کے بعد آپ کے رفیقوں اور صحابیوں کا لقب ہی حواری پڑ گیا۔ اور مجازی معنی مخلص و مطیع کے بھی قرار پا گئے۔

چنانچہ حدیث میں حضرت زبیر صحابی کے لئے حواری رسول کا لقب آیا ہے۔

اٰمَنَّا بِاللّٰہِ ج وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (آیت ۵۲)

ہم ایمان لے آئے اللہ پر اور آپ گواہ رہیے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا

مَعَ الشّٰہِدِیْنَ ○ (آیت۔ ۵۳)

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے اس پر جو کچھ آپ نے اُتارا ہے اور ہم نے پیروی اختیار کی ان رسول کی سو ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجئے جو تصدیق کرتے ہیں۔

یہ اہل کتاب ہر دور کے سچے مسلمانوں کی طرح توحید کے پورے طور پر قائل تھے اور "ابن اللہ" اور "اقنوم" وغیرہ کے تخیل سے بھی ناآشنا۔ مسیح کے یہ صحابی مسیح سے گفتگو کرتے کرتے غلبۂ توحید سے براہ راست اللہ سے مناجات کرنے لگے ہیں۔ قرآن مجید نے ایسے موقعوں پر بار بار یہ کیا ہے کہ بندوں کی گفتگو کا رُخ دفعۃً اللہ سے مناجات کی طرف پھیر دیا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا۔ اس مکالمہ کے بعد جو کچھ گزری اسے بجائے تفصیل کے قرآن مجید نے اس موقعہ پر کمال ایجاز سے دو ہی لفظوں میں ادا کر دیا ہے۔

وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ ○ (آیت ۵۴)

اور ان لوگوں نے خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی، اور اللہ بہترین خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔

لفظ مکرؔ، اللہ کی جانب منسوب کرنے سے آپ وحشت نہ کریں۔ یہ اُردو کا مکر نہیں۔ جو ہمیشہ برائی ہی کے موقع پر آتا ہے اور جس کا مرادف فریب اور دھوکا ہے۔ یہ عربی کا مکر ہے جس کے معنی صرف خفیہ تدبیر کے ہیں۔ یہ بُرے اور اچھے ہر موقع کے لئے عام ہے حضرت مسیح پر مقدمہ چلنے اور پھر عدالت سے حکم سزا پانے کے بعد آپ جس طرح نفاذ سزا سے محفوظ رہے، یہ ساری داستان ایک دوسری صحبت میں تفصیل سے سُنئے گا

(۳۳)

اسی سلسلہ میں چند آیتوں کے بعد ذکر حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا آتا ہے۔ اب

وہ ملاحظہ ہو:

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (آیت ۵۹)

بے شک حضرت عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کے حال کی طرح ہے اللہ نے ان کو مٹی سے بنایا۔ پھر کہا جاندار ہو، چنانچہ وہ وجود میں آ گئے۔

یہ مثلیت عیسیٰؑ و آدمؑ کے درمیان کس حیثیت سے، جواب ہے کہ بشر محض اور حادث مخلوق ہونے کا اشارہ عیسائیوں کے عقیدہ ابن اللّٰہیت کی جانب ہے۔ سوال انھیں سے ہو رہا ہے کہ تم عیسیٰ کو فوق البشر کیسے مان رہے ہو؟ اگر یہ کہو کہ وہ بغیر باپ کے توسط کے پیدا ہوئے، اس لئے فوق البشر ٹھہرے، تو پھر آدم کو بھی فوق البشر کیوں نہیں مانتے وہ تو عیسیٰ سے بھی عجب تر صورت سے پیدا ہوئے یعنی ماں اور باپ دونوں کے توسط کے بغیر۔ اللہ کسی بشر کے پیدا کرنے پر کسی مخصوص، متعین طریقۂ وجود وظہور پر مجبور نہیں۔ مطلق مشیت اس کے لئے کافی ہے۔ اور یہی تو آفرینش عیسیٰ میں پوری طرح موثر تھی

حضرت عیسیٰ کے بے باپ کے پیدا ہونے پر کوئی صراحۃ النص قرآن مجید میں نہیں، لیکن اتنے کھلے ہوئے اشارے اور قرینے موجود ہیں، جو اس عقیدے کو قریب بہ صراحت بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔

خود مسیحیوں میں ایک قدیم فرقہ (Arians) کا ہوا ہے۔ اس کا بانی Arius چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کا لاٹ پادری تھا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم کی جلد اول ص۲۴۰۰ پر اس کی تعلیم بھی درج ہے کہ مسیح قدیم وغیر مخلوق نہیں۔ مخلوق وحادث ہیں۔ اور ان سے بھی قبل تیسری صدی عیسوی میں انطیوخ (انطاکیہ) کے بطریق پال کی تلقین بھی یہی تھی کہ عیسیٰ مسیح کی پیدائش ایک دوشیزہ کے بطن سے ہوئی تھی۔ بہ واسطہ روح القدس اس لئے تھے وہ بشر محض، ہاں روح القدس کے توسط نے انھیں مقدس

بھی بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ مسیح بھی تھے۔ لیکن شریک الوہیت بہر حال نہ تھے۔ اس عقیدہ کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس جلد ۱۱ ص ۱۷۱

مسیحیوں کے صاحب فہم طبقہ میں اصلاحی تحریکیں صحیح عقیدہ کی برابر اٹھتی رہی ہیں۔ لیکن کلیسا کے عام جمود و تصلب نے کبھی ان اصلاحوں کو آگے بڑھنے اور سرسبز نہ ہونے دیا۔ خود آج بھی مسیحیوں میں ایک فرقہ موحدین (Unitarians) کے نام سے موجود ہے جس میں بڑے بڑے مشہور قابل فاضل ہوئے ہیں۔ مثلاً آنجہانی ال، پی جیکس (L.P.JACKS) ایڈیٹر ہیبرٹ جرنل (HIBBERT JOURNAL) اس کی تعلیم بھی اس سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ یہ فرقہ تثلیث کا بالکل منکر و مخالف ہے اور حضرت مسیح کو افضل البشر اور برترین انسان مانتا ہے۔ لیکن ان کی الوہیت کا قائل کسی درجہ میں بھی نہیں

(۳۴)

اور اسی مکالمۂ مسیح و مسیحیت کے تتمہ کے طور پر وہ آیت بھی ملاحظہ ہو جائے، جس کا تعلق سیرت نبوی کے ایک اہم واقعہ سے ہے۔ مدینہ منورہ میں آپ کے قیام کو نو سال ہو چکے تھے اور حجاز پر پورا تسلط مسلمانوں کا قائم ہو چکا تھا کہ ۹ھ میں نجران (NAGRAN) کے مسیحیوں کا ایک وفد چودہ ارکان پر شامل خدمت میں حاضر ہوا، گفتگو الوہیت مسیح پر رہی۔ اسلامی عقیدہ یعنی بشریت مسیح کی معقولیت بالکل واضح و ظاہر تھی۔ لیکن وفد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ادھر آپ کو دھن لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح یہ لوگ بھی دین حق قبول کر کے جنت کے وارث و حقدار بن جائیں۔ آخر میں آپ نے وہی کیا جو شاید ہر سچا اور مخلص داعیٔ حق ایسے موقع پر کرتا۔ آپ نے فرمان خداوندی کے تحت عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دے دی، کہ زبانی گفتگو تو بہت کچھ ہو چکی، اب آؤ، ہم تم اپنے خاص عزیزوں کو اپنے ہمراہ لے کر اپنے پروردگار ہی سے بہ تضرع و الحاح

عرض کریں کہ جو فریق ناحق پر ہو اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو، آپ نے یہ فرمایا اور اپنی اولاد حقیقی و حکمی یعنی سیدہ فاطمہؓ و سیدنا علیؓ، سیدنا حسنؓ، سیدنا حسینؓ کو ہمراہ لے کر تشریف لے آئے، لیکن تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ عیسائیوں کی ہمت عین وقت پر جواب دے گئی، اور عافیت اسی میں نظر آئی کہ بجائے اس آزمائش میں پڑنے کے، جزیہ دے کر اور ذمی رعایا بن کر اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا گوارا کرلیا۔

اب قرآن کا بیان سنئے

فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (آیت ۶۱)

تو آپ (ان مسیحیوں سے) کہہ دیجئے کہ اچھا آؤ، ہم بلا لائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے کو بھی اور تمہارے تئیں بھی، پھر ہم خشوع سے دعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔

سر ولیم میور کی سیرت محمدی (Life of Mohammed) انیسویں صدی میں اپنے موضوع پر مشہور ترین کتاب تھی اور سر ولیم میور کوئی مسلمان نہیں، مسیحی تھے، اور محض مسیحی ہی نہیں، مشنری یا مبلغ مسیحیت بھی۔ اپنی اسی کتاب میں صفحہ ۳۶۰ پر یہ واقعہ کو نقل کر کے لکھتے ہیں:

" واقعہ میں محمد کے ایمان کی پختگی بالکل نمایاں ہے، نیز ان کے اس عقیدہ کی شہادت کہ ان کا تعلق عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لئے کہ حق تمام تر انھیں کے ساتھ ہے۔ اور یہ کہ ان کے خیال کے مطابق مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے کچھ نہ تھا۔

(۳۵)

توحید پر زور تو قرآن مجید میں بے شمار بار آیا ہے۔ یہاں بھی دو آیتوں کے بعد اہل کتاب نصرانیوں سے خطاب اس موضوع پر زوردار انداز سے ہے:۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آیت ۶۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب آجاؤ ایسے معمول کی طرف جو ہم میں تم میں مشترک ہے کہ ہم بجز اللہ کے کسی کی پرستش نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائیں، پھر اگر وہ شبہ کریں تو تم کہہ دو (اے مسلمانو) کہ تم گواہ رہنا ہم تو بہر حال فرمانبردار تھے۔

سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ یعنی وہ بنیادی عقیدہ جو ہم مسلمانوں اور تم نصرانیوں دونوں کو مسلم ہے اور وہ دونوں میں مشترک ہے جس کی قدر و قیمت اور افادیت پر سب کو اتفاق ہے اور جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیمبران برحق ہمیشہ دیتے آئے ہیں، اور یہودیت و نصرانیت دونوں دینوں کی بنیاد ہی اسی اصل پر ہے

توریت تو خیر تاکید توحید اور رد شرک سے لبریز ہی ہے، انجیل میں بھی تعلیم یہی موجود ہے۔ متی باب ۴ کی آیت ۱۰ میں ہے:

"تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر"

اور یہ تو ساری انجیلوں میں کہیں بھی نہیں ملتا ہے، نہ صراحۃً نہ دلالۃً نہ اشارۃً کہ کچھ پرستش تو صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں ابن اللہ اور روح القدس کو بھی

شریک کر لیا کرو۔

اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ، مخلوق پرستی اور مخلوق کی شرکت اُلوہیت کی تردید تو آپ سُن ہی چکے۔ اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہو رہی ہے۔ غیر اللہ جس طرح معبود و الٰہ نہیں، اسی طرح رب و مطاع مطلق بھی نہیں۔ نصرانیوں نے طرح طرح کے شرک نکال لیے تھے، اسی طرح عصمتیں بھی طرح طرح کی گڑھ رکھی تھیں۔ پاپائے روم کی معصومیت، کیتھولک دنیا، اور کلیسا یعنی پادریوں کے اجماع کی معصومیت کل مسیحی دنیا کا متفقہ عقیدہ ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم، جلد ۱۶ ص ۶۳۰ پر یہ عقیدہ یوں درج ہے:

"ایک مخصوص کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں۔ اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے۔ اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہی نہیں"۔

قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگا دی، اور کسی کو رب ٹھہرانے کے لئے یہ لازمی نہیں کہ لفظاً و قولاً اسے رب ہی کہا جائے۔ کسی فقیہہ کو، مرشد کو، امام کو اگر معصوم مان لیا اور اس کے قول کو دلیل سے بے نیاز قرار دے لیا تو یہ اسے رب ہی مان لینا ہوا۔

بَعْضُنَا بَعْضًا۔ مفسر ابن حیان غرناطی نے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ الوہیت و ربوبیت دونوں کی تردید تو اسی ایک فقرے سے ہو گئی۔ جب ایک دوسرے میں مثلیت اور رشتہ ہم نسبی کا قائم ہو گیا تو سب بندے ہونے کی حیثیت سے برابر ہو گئے۔ اور الوہیت و ربوبیت اب باقی ہی کہاں رہ گئی۔

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ، قرآن کے اعجازی انداز بیان کا ایک اور نمونہ۔ اہل کتاب نصرانی یا یہودی تو آج بھی اسلام کی توحید خالص کی گواہی دے رہے ہیں۔ اور وہ اپنی کتابوں میں لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلم قوم توحید خالص کی حامل ہے۔

(۳۶)

یہ بنیادی حقیقت، کہ دین مقبول اللہ کے ہاں صرف اسلام ہی ہے نہ کہ ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے پکارا جاتا ہے، پہلے بھی بیان ہو چکی تھی اور اسی سورہ آل عمران میں

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔

دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔

یعنی اسلام اپنے اصطلاحی معنی میں، ورنہ لفظی معنی میں تو ہر بھاگ جانے کو اسلام ہی کہتے ہیں۔

اب یہاں اس سے بڑھ کر قطعی صورت میں اعلان ہوتا ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ (آیت ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین (اپنے لئے) تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز نہیں قبول کیا جائے گا۔ اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں ہوگا۔

تاکید در تاکید دیکھیے، اثباتاً و نفیاً دونوں طریقوں سے بیان کا ماحصل یہی ہے کہ دین نجات دلانے والا، آخرت میں کام آنے والا دین، تو بس یہی اسلام ہی ہے۔ جس کی کتاب قرآن ہے، اور جس کے لانے والے محمد رسول اللہ ہیں۔ اس ایک دین کے سوا اور جتنے بھی دین اپنی موجودہ صورت میں موجود ہیں، ان کی مثال فرسودہ اور ٹکسال باہر سکوں کی ہے کہ گننے کو سکے تو وہ بھی ہیں۔ لیکن وہ سکے جب بازار میں چل نہ سکیں، تو ان کا سکہ ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دوسرے دین و مذہب اصلاً کیسے ہی رہے ہوں ان کی موجودہ صورت میں انھیں دین حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین و مذہب کو

نجات کے لئے کافی سمجھنا، یا سب مذہبوں کو ملا جلا کر ان کا ایک ملغوبہ تیار کر نام یہ کہنا کہ دیر و حرم، کعبہ و کلیسا، شیخ و برہمن، مسجد و بت کدہ، سب یکساں ہیں اور ایک حکم میں داخل، یہ سب ضلالت و بے دینی ہی کی شکلیں ہیں، اکبر و فیضی، ابو الفضل، دارا شکوہ، وغیرہ ان ناکام کوششوں کے لئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں اور وحدت ادیان کے نام سے آج بھی بعض اہل قلم اسی نامراد مرض میں مبتلا، اپنی روشن خیالی اور رواداری کے پردے میں اعلان اسی بد دینی کا کر رہے ہیں۔

(۳۷)

خانہ کعبہ کی قدامت بھی اہل کتاب کے لئے ایک مختلف فیہ مسئلہ رہی ہے۔ قرآن مجید نے اس کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے، پہلے ذکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صحیح مقتدائی اور پیشوائی کا ہے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰہُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ○ آیت ۹۵

آپ کہہ دیجئے (اے رسول) کہ اللہ نے سچی بات فرما دی تو تم پیروی کرو سیدھی راہ پر چلنے والے ابراہیم کے دین کی اور وہ تو مشرکین میں سے نہ تھے۔

یعنی قرآن نے امر حق واضح کر دیا اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے ہی مقدس نوشتوں پر باندھے تھے، ان سب کی قلعی کھول دی۔ تو تم سب، کیا اہل کتاب اور کیا مشرک، ابراہیم ہی کی پیروی کرو۔ اور خود بھی سچے اور ان کا لایا ہوا دین بھی سچا۔ اور جنھیں تم بھی اپنا پیشوا مانتے ہو۔ ان میں تو بہرحال کہیں سے بھی شائبہ شرک نہ تھا۔

اور اس کے متا بعد ذکر ان کے شہر مکہ اور ان کی تعمیر کعبہ کا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ○ آیت ۹۶)

بے شک سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کے لئے) برکت والا اور سارے جہان والوں کے لئے رہنما۔

دنیا میں پہلا مکان بہ طور عبادت گاہ کے یعنی خانۂ کعبہ، جس کی روایات حدیث کے مطابق ابتدائی تعمیر حضرت آدمؑ نے کی تھی اور منہدم ہونے کے بعد، پھر اس کی از سر نو تعمیر حضرت خلیلؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

قرآن کریم دعویٰ سے کہتا ہے کہ قدیم ترین عبادت گاہ اس سرزمین پر ہے، اور دیکھیے کہ ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ (HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD) والے کیا کہتے ہیں۔

"یہ پتھر کی مربع عبادت گاہ جس کی عمر نامعلوم قدامت کی ہے، مکہ کے حدود کے اندر تھی" (جلد ۸ صفحہ ۱۰۵)

اور پھر کہتے ہیں:۔

"نسلہا نسل سے یہ مقدس ترین عظمت کی حامل رہی ہے۔ اور اس کی بابت عقیدہ یہی رہا ہے کہ خود یہوداہ (خدا) نے اسے عرب قوم کو بہ طور تحفہ دے دیا تھا کہ وہ دوسری قوموں پر اس قوم کے تفوق کی گواہ رہے۔ یہ ابراہیم اور ان کے فرزند اسمٰعیل کا عبادت خانہ بیت اللہ رہا ہے" (جلد ۸ صفحہ ۱۶۹)

گویا اس کی قدامت کی تاریخ، تاریخ کے حافظہ میں بھی نہیں۔ اتنی غیر معمولی قدامت فرنگی فاضلوں کو بھی تسلیم ہے اور اس کا شروع ہی سے عبادت خانہ ہونا مسلّم ہے۔ کعبہ کو قدیم ترین عبادت گاہ کہہ کر یہود کو بتا دیا گیا کہ یہ بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔

اور سنئے عہد نامہ عتیق میں اتنی تحریف و تصرف کے باوجود بھی ایک جگہ ذکر بکہ کا باقی رہ گیا ہے۔ چنانچہ زبور داؤد کی مناجات ۸۴ کی آیت ۶ میں ہے۔

"وہ بکہ کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے"

اور بائبل کے قدیم مترجموں نے ترجمہ میں اپنی بے احتیاطی کی عام عادت کے مطابق اسے بجائے علَم اور اسم مکان قرار دینے کے اسم نکرہ قرار دے دیا ہے۔ اور اس کا ترجمہ "رونے کی وادی" کر ڈالا۔ صدیوں کے بعد اب غلطی کا احساس ہوا، اور اب جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اقرار ہے کہ یہ ایک مخصوص بے آب وادی کا نام ہے (جلد ۲ ص۱۱۵) اور اب جتنا قریب آ گئے ہیں تو اللہ انھیں یہ لکھنے کی توفیق اور دے کہ یہی وادی بے آب مکہ معظمہ ہے۔

بکّۃ۔ مکہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ عربی علم الصرف کے ایک قاعدہ کے مطابق میم اور ب کے درمیان تبادلہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ لازم اور لازب اور راتم اور راتب کی مثالیں ہیں۔

اسی قاعدہ کے ماتحت مکہ بکہ کا مرادف و متبادل ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ نام ہے کل شہر کا۔ اور بکہ کا اطلاق ہوتا ہے مسجد حرام اور مطاف پر۔

ان مختصر لفظوں میں اس کی دو صفات بیان کر دی گئی ہیں۔ ایک مُبارَکًا یہ وہ مقام ہے جہاں مادی اور روحانی، دینی و دنیوی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ دوسرے هُدًى لِّلْعَالَمِينَ سارے جہاں کے لئے مرکز ہدایت ہے۔

بہ طور قبلہ کے

اور مورخ مسعودی نے اہلِ جاہلیت کا یہ عقیدہ نقل کیا ہے کہ بیت الحرام ستارہ زحل کا ہیکل (مندر) ہے اور زحل اس کا مربی ہے۔ اور چونکہ زحل کی صفت بقائے دوام ہے۔ اس لئے جو چیز بھی اس کی جانب منسوب ہو گی اسے بھی زوال نہ ہوگا۔ اور اس کی تعظیم و تکریم سدا باقی رہے گی۔

عقیدہ جاہلیت کا سہی تاہم اس سے شہادت تو کعبہ کی قدامت کی مل ہی جاتی ہے۔

(۳۸)

قرآن مجید کی چوتھی سورت کا نام سورہ النساء ہے۔ اور نساء کہتے ہیں عورتوں کو۔ اس لمبی سورۃ میں بیشتر بیان عورتوں کے مسائل اور ان کے احکام اور عورتوں کے حقوق و فرائض کا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نظام معیشت میں کتنا بڑا دخل اور کتنی اہمیت عورت کو حاصل ہے۔ علاوہ بیسیوں متفرق عنوانات کے ایک مستقل سورۃ ہی اس موضوع پر ہے۔ پہلی ہی آیت کتنے مختلف پہلوؤں پر شامل اور کیسی کیسی حکمتوں کی جامع ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ

اے لوگو تقوے اختیار کرو اپنے پروردگار کا جس نے تم (سب) کو ایک جان سے پیدا کیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ خطاب قریش، بلکہ محض اہل عرب سے بھی نہیں، بلکہ سارے ہی انسانوں، نوع بشر سے ہے۔

یہ عنوان خطاب بجائے خود پیام اسلام کی عالمگیری کا اعلان کر رہا ہے۔ انسان کسی نسل، کسی رنگ کا ہو، ہر حال ایمان کا بلکہ کسی حد تک تقوے کا مکلف ہے۔ النَّاس یوں سارے نوع بشر کے لئے ہے۔ اور پھر جب سورت مکی ہے بھی نہیں۔ بالاتفاق مدنی ہے۔

اتَّقُوا رَبَّكُمُ اللہ سے ڈرنا دراصل اس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات بجائے خود کوئی خوف کھانے والی چیز نہیں۔ بلکہ سرتاسر محبت و عظمت ہی کے قابل ہستی ہے اور لفظ رَبَّكُمُ لاکر اشارہ کر دیا ہے کہ جن احکام کی

مخالفت سے ڈرایا اور روکا جا رہا ہے۔ ان سے مقصود تمامتر بندے ہی کی ربوبیت اور پرورش ہے۔

خَلَقَكُمْ مسئلہ ارتقا جس حد تک اور جس معنی میں بھی صحیح ہو، قرآن مجید کو اس کوئی بحث نہیں۔ وہ زور صرف اس پر دیتا ہے کہ انسان چاہے بتدریج ہی وجود میں آیا ہو، بہرحال اللہ کا خلق کیا ہوا، نیست سے ہست میں اللہ ہی کا لایا ہوا ہے۔ وہ ضرب انسان کی خود وجودی پر لگاتا اور اثبات اس کی مخلوقیت کا کر رہا ہے۔

مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ، یعنی ابوالبشر آدم علیہ السلام سے۔ وحدتِ نسل انسانی کا سبق اپنے علمی اور دوررس نتائج کے لحاظ سے بڑا ہی اہم ہے۔ آخری مورث اعلیٰ ہر فرد بشر کے، ہر کالے اور ہر گورے کے، ہر برہمن اور ہر شودر کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے، ابوالبشر حضرت آدمؑ ہیں۔ یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورث اعلیٰ کوئی ہوں، اور فلاں نسل کے کوئی اور۔ اور نہ یہ کہ برہمن نسل کے لوگ برہماجی کے سر سے پیدا ہوئے اور چھتری نسل والے برہماجی کے سینے سے اور ویش ان کی ٹانگوں سے ——— اصلاً سب انسان انسان ایک ہی ہیں۔ آج کا انسان اگر اسی ایک سبق کو یاد رکھ لے تو جنگیں اور خوں ریزیاں کتنی کم ہو جائیں اور مابعد یہ ارشاد ہوتا ہے وخلق منہا زوجہا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، یعنی حوا زوجۂ آدم علیہ السلام کو۔ یہ تخلیق کس طرح سے ہوئی ہے اس کے ذکر سے قرآن مجید بالکل خاموش ہے اور حدیث بھی تقریباً ——— جس سے معلوم اور معروف روایت کا حوالہ دیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ آدم کا نہ حوا کا۔ اس میں بیان محض عورت کی کج سرشتی کا ہے۔

مِنْهَا میں هَا کی ضمیر عموماً نفس کی طرف راجع سمجھی گئی ہے لیکن ایک دوسرا قول بھی تفسیروں میں نقل ہوا ہے کہ مِنْهَا یہاں جِنْسِهَا کے معنی میں ہے۔ کبیر میں ابومسلم اور بحر المحیط میں ابن حجر کے حوالہ سے اور جنس عورت کے معنی لیکر۔

تو حضرت حوّا کی ذات کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

یہ روایت تو صرف توریت مروجہ کی ہے کہ خدا نے آدم کی ایک پسلی ان کے سونے کی حالت میں نکالی اور نکالی ہوئی پسلی سے ایک عورت پیدا کر کے آدم کے پاس بھیجدی۔ اور یہ روایت صحیفۂ پیدائش باب دوم کی آیت ۲۲-۲۳ میں ہے۔

رہی حدیث نبوی تو جس حدیث کا حوالہ بار بار دیا جاتا ہے تو وہاں ذکر نہ حضرت آدم کا ہے نہ حضرت حوّا کا بلکہ محض عورت کی جنس کی پیدائش اور اس کی کج سرشتی کا ہے۔ پھر یہ بھی بالکل ممکن ہے کہ حدیث میں حضرت حوا کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے بطور استعارہ ارشاد کر دی گئی ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی یا عجلت پسندی سے ہوئی ہے۔ اور تفسیر بحر المحیط میں اسی پہلو کو پیش کیا گیا ہے، اور اس معنی کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ حوّا کو اس طرح پیدا کیا گیا، بلکہ جنس عورت کا ذکر ہے اور یہ بہ آسانی مجاز و استعارہ پر محمول ہو سکتا ہے۔ چنانچہ لغت حدیث مجمع البحار میں یہ قول کرمانی کے حوالہ سے نقل ہوا ہے اور ایک حاشیہ تفسیر ابن کثیر میں بھی ایسا ہی نقل ہوا ہے۔

اور خود ایک حدیث نبوی صحیح بخاری کی کتاب النکاح میں اور صحیح مسلم کی کتاب الرضاع میں اس مضمون کی نقل ہوئی ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے اور لغت میں خود ضلع کا مفہوم تو ثانوی ہی ہے۔ ورنہ اصل معنی تو کجی یا میل یا انحراف ہی کے ہیں۔ زمخشری کی مشہور لغت حدیث کتاب الفائق میں ہے الضلع المیل یعنی ضلع جھکاؤ کو کہتے ہیں اور اسی سے ملتی ہوئی عبارت ابن اثیر کی لغت حدیث نہایہ کی ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے:-

وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ

اور پھیلا دیے ہم نے ان دونوں سے مرد اور عورت کثرت سے

دنیا کی انسانی آبادی اب تک جتنی ہو گئی اور جتنی قیامت تک ہو گی سب اسی سے ہو گی۔ لفظ کثیر کا اطلاق اگر اس ان گنت آبادی پر بھی نہ ہو گا تو اور کس پر ہو گا؟

خیال اس سلسلہ میں صرف یہ رہے کہ یہ نسل غیر محدود و غیر معدود حضرت آدمؑ ہی کی نہیں بلکہ آدمؑ و حواؑ دونوں کی ہے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ

اس اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطے سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور قرابتوں کے باب میں بھی۔

تقویٰ الٰہی یا ادائے حقوق اللہ کا حکم ابھی ابھی مل چکا ہے، اور ایک ہی آیت کے اندر دوبارہ پھر مل گیا۔ جتنی تاکید اس سے مقصود ہے ظاہر ہی ہے، لیکن اب کی جو حکم تقویٰ ملا وہ ارحام یعنی عزیزوں یا قرابت داروں کے باب میں ہے، اور الارحام کا عطف اللہ پر ہے۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ جس طرح محتاط حقوق اللہ کے باب میں رہتے ہو۔ اسی طرح قرابتوں کے معاملہ میں بھی رہو۔ یہ ہے قرابت یا رشتہ داری کی اہمیت اسلام میں!

درحقیقت اُمت کے نظام اجتماعی کا سنگ بنیاد ہی شریعت نے خاندان کو قرار دیا ہے، عزیزوں، قریبوں، خاندان اور برادری والوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اسلام میں کوئی دوسرے درجہ کی نہیں۔ اوّل درجہ کی اہمیت رکھنے والی چیز ہے۔ اور اسی معنی میں ایک حدیث نبوی بھی ہے کہ رحم یعنی رشتہ قرابت اللہ سے دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے رکھتا ہے اللہ اسے جوڑے رہے۔ اور جو مجھے قطع کرتا ہے اللہ اسے قطع کرے اور آیت کا خاتمہ اس ٹکڑے پر ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝ (آیت ۱)

بے شک اللہ تمہارے اوپر نگراں ہے۔

یعنی اس حکم کو ہلکا اور سرسری نہ سمجھو، وہ عالم الغیب جس طرح تمہاری عبادتی زندگی کا نگراں ہے اسی طرح وہ تمہارے خانگی، اجتماعی سارے ہی معاملات کا نگراں ہے! — آج اس حکم کا استحضار اگر دلوں میں رہے تو اُمت کے اندر اس قدر تلخیوں، رنجشوں خانہ جنگیوں کا وجود کہیں باقی نہ رہ جائے؟ لیکن بہر صورت جہاں تک کتابی تعلیم کا تعلق ہے، اسلام خانگی حقوق اور ذمہ داریوں کی تاکید کے لحاظ سے بس آپ ہی اپنی مثال ہے۔

(۳۹)

مذہب کے دائرے میں ایک اہم مسئلہ توبہ اور قبول توبہ کا آتا ہے، گناہ نام ہے کسی حکم الٰہی کی دانستہ خلاف ورزی کا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بشری فطرت کی کمزوری کے لحاظ سے گناہوں کا صدور تو ناگزیر سا ہے، تو اب گرفت اور عذاب الٰہی سے بچنے کی کوئی راہ بھی ہے! بعض مذہبوں نے کرم یا مکافات عمل کے قانون کے نام سے اس باب کو سرے سے بند ہی کر دیا ہے، یہ کہہ کر کہ ہر شخص کو اپنے ہر عمل کا نتیجہ ہر حال میں بھگتنا ہی پڑے گا، اور بعض مذہبوں نے اس کے برعکس معافی کا دروازہ شفاعت کے تحت میں لا کر اتنا وسیع کر دیا ہے کہ کوئی گناہ گناہ ہی نہیں رہ جاتا۔ جب ایک مستقل اور مطلق شافع موجود ہے، تو پھر وہ ہر مجرم کو چھڑا ہی لے گا اور جزا کا قانون سرے سے معطّل و مہمل ہی ہو کر رہ جاتا ہے۔

قرآن نے حکیمانہ راستہ توسط و اعتدال کا اختیار کیا ہے، اس نے ہر اختیاری جرم کے لئے ندامت، پچھتاوے، کی راہ کھلی رکھی ہے، جب بھی مجرم کو اپنی غلطی، غلط کاری کا احساس ہو جائے، اس کا عملی تدارک تلافی اور کفارے سے کر دے اور اگر اس کی گنجائش ہی نہ باقی ہو تو حاکم مطلق کی بارگاہ میں معافی پیش کرے، پچھتائے، گڑگڑائے، روئے دھوئے، وہ غفور رحیم توبہ قبول کرے گا، اور اسے معافی کا پروانہ عنایت کر دے گا — ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰٓئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ (آیت ۱۷)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے، وہ تو بس انھیں لوگوں کی ہے، جو بری حرکت نادانی سے کر گزرتے ہیں، اور پھر قریبی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے، اور اللہ بڑا علم والا بڑا حکمت والا ہے۔

يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ۔ سُوٓء کا لفظ عام ہے، چھوٹی بڑی ہر ہر معصیت کے لئے۔ جہالت کے معنی نادانی کے ہیں۔ یہاں مجرم کی نفسیت بیان کی ہے کہ جرم کے ارتکاب کے وقت اس کے نتائج کا ذہن سے ذہول ہو گیا۔ اور عقل سلیم غلبۂ ہیجان نفس سے وقتی طور پر اندھی ہو گئی۔ عَلَى اللّٰہ اللہ کے ذمہ۔ حقیقۃً تو اللہ پر واجب کوئی بھی چیز نہیں۔ یہاں قبول توبہ کو اللہ پر واجب تاکید کے معنی و مفہوم میں فرما دیا گیا ہے۔

مِن قَرِيبٍ ، توبہ جتنی جلد کر لی جائے، یعنی غلبۂ نفس اور مغلوبیت عقل کے وقت جو گناہ سرزد ہو جائے اس پر پشیمانی اور اس عمل سے باز رہنے کا عزم جس قدر جلد قائم کر لیا جائے، اتنے ہی قبول توبہ کے موقع زیادہ رہتے ہیں۔ اور جتنی اس میں تعویق و تاخیر ہوتی چلی جائے گی، اسی قدر قبول توبہ کے امکانات بھی ضعیف ہوتے جائیں گے۔ لیکن شریعت نے عین شفقت و رحمت اور بندہ نوازی سے کام لے کر اس قرب کی میعاد عین حضور موت سے قبل تک وسیع کر دی ہے۔ ابن عباسؓ صحابی اور متعدد تابعین سے آیت کی شرح و تفسیر میں یہی منقول ہے۔

كَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وہ اپنے مرتبۂ علم کے لحاظ سے خوب جانتا ہے کہ کون مخلص ہے اور دل سے توبہ کرنے والا ہے، اور اپنی شانِ حکمت، کے لحاظ سے تائب غیر مخلص کو بھی رسوا کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دیتا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ (آیت ۱۸)

اور توبہ ان لوگوں کی نہیں، جو برابر گناہ کرتے رہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو، اور اس وقت وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ (ان لوگوں کی) جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں۔ ان کے لئے ہم نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یعنی قاعدہ اور ضابطہ ایسے لوگوں کی بخشش کا نہیں، جو گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں اور انھیں کو اپنا شعارِ زندگی بنا لیا ہے۔ ان سے قبول توبہ کا وعدہ نہیں۔ باقی اگر کسی سے وہ غفور و رحیم رحمت و مغفرت ہی کا معاملہ کرنا چاہے، تو اس کے فضل و کرم کی راہ میں کسی کی کیا مجال جو حائل ہو سکے۔

اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ، یعنی عالم ناسوت کے حدود شکست ہونے کے بعد، عالمِ غیب کا مشاہدہ ہونے لگے، تو اب توبہ اختیاری نہ رہے گی، بلکہ اضطراری بن جائے گی جو مقبول کسی درجہ میں بھی نہیں۔

آیت ماقبل میں السُّوْٓءَ بہ صیغۂ واحد تھا۔ اور اب ”سَیِّاٰت“

(بہ صیغۂ جمع) آگیا۔ یہ فرق قابل غور و لحاظ ہے۔ پہلی آیت میں ذکر جلد توبہ کر لینے والوں کا تھا، اور اس دوسری آیت میں ان کا ہے۔ جو اپنے گناہوں کا بوجھ نفسانیت میں ڈوب کر برابر بڑھاتے جاتے ہیں۔

وَهُمْ كُفَّارٌ۔ کافر کی توبہ کا موت کے وقت غیر مقبول رہنا پہلی آیت میں شامل تھا۔ عجب نہیں کہ یہ مزید تاکید و مزید تفضیح کے لئے ہو۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چوتھا خطبہ

(۴۰)

فطرت نے انسان کی تقسیم دو جنسوں میں، اس کی پیدائش کے ساتھ ہی رکھ دی ہے۔ نر اور مادہ، مذکر اور مؤنث، مرد اور عورت اور ان دونوں کے باہمی تعلق کا مسئلہ شروع سے نازک و پیچیدہ چلا آرہا ہے۔ پرانی تہذیبیں تو زیادہ تر اس طرف گئیں کہ عورت۔ ایک صنف حقیر و ذلیل ہے۔ مردوں کی محکوم اور باندی۔ بچپن بھر باپ کی قید میں رہے۔ بڑی ہوکر بھائی یا شوہر کی جکڑ بند میں۔ اور آخر عمر میں لڑکوں کی کڑی نگرانی میں۔ جدید تہذیب کا ردعمل اس کے ٹھیک برعکس اس حد تک ہوا کہ نوبت مادر پدر آزادی کی آگئی۔ اب دیکھیے کہ قرآن اس مسئلہ کو کس حکیمانہ و عادلانہ نظر سے دیکھ رہا ہے۔ سورۃ النساء تو ہے ہی خاص عورتوں کے مسائل کے لئے، اس کی آیت ۳۲ ملاحظہ ہو:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ

اور تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو، جس میں اللہ نے بڑائی دے رکھی ہے تم میں سے ایک دوسرے پر۔

بڑائی سے مراد ہے طبعی اور وہبی طور پر بلا دخل کسی عمل و کسب کے، مثلاً کوئی دولت مند ہے، کوئی حسین و جمیل ہے، کوئی خوش گلو ہے، کسی کے قوائے جسمانی بڑے مضبوط ہیں، اس قسم کے طبعی وہبی فضائل کو قرب حق میں مطلق دخل نہیں، اور ان کی بنا پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کے مثل و مانند ہونے کی حسرت و تمنا کرنا

درست نہیں۔ قرب حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے، رحمت و مغفرت و قرب حق کا مدار تو اعمال ارادی و اختیاری پر ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ

مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصّہ (ثابت) ہے، اور عورتوں کے لئے اُن کے اعمال کا حصّہ (ثابت) ہے۔

اور اس حیثیت سے مرد اور عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے۔ عورتوں کے لئے بھی قانون وہی ہے جو مردوں کے لئے۔ یہ فرق محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دئے گئے ہیں۔ ان میں رشک و حسرت کا کوئی محل نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا کہ مرد کا کچھ اجر اس کے مرد ہونے کی بنا پر بڑھ جائے، یا عورت کا کچھ اجر اس کے عورت ہونے کی بنا پر گھٹ جائے۔ ایک مکلّف بشری مخلوق ہونے کی حیثیت میں، اس میں اور مرد میں کوئی فرق نہیں۔ مرد، مرد ہونے کی حیثیت سے ہرگز اللہ کے ہاں مقرب تر اور نجات کا مستحق تر نہیں، اور عورت ہرگز اپنی جنس کی بنا پر کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہے گی۔ عورت اپنا احساس کمتری دور کرے اور سمجھ لے کہ وہ مرد سے فروتر مخلوق نہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مذہبوں نے قرار دے رکھا ہے۔

ہندوؤں نے اپنے منوسمرتی کے اوراق میں اور کیتھولک کلیسا نے اپنے جلسوں اور کونسلوں میں صدیوں تک جو فیصلے عورتوں کی پستی اور پست فطرتی کے کئے ہیں آیت ان سب کی تردید کرتی رہی ہے، اور آگے ہے۔

وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ‎(آیت ۳۲)

اللہ سے اس کے فضل کی طلب کرو۔ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

چنانچہ اس نے اپنے علم کامل کے مطابق ہر مخلوق کو صلاحیت اور استعداد بخشی، اور

وہی ہر ایک کی فردِ عمل پر پوری طرح مطلع بھی ہے، تو اس کا فضل توفیق اعمال میں بے شک طلب کرتے رہو۔ رشک و تمنا والی اور دعاؤں میں طلب کرنے والی چیز وہ وہبی و طبعی خصوصیتیں نہیں، بلکہ یہ نعمت توفیقِ حسنِ عمل ہے۔

اور ایک آیت کے بعد آگے ارشاد ہوتا ہے :۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (آیت ۳۴)

مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں، اس لئے کہ اللہ نے انھیں ایک دوسرے پر بڑائی دی ہے، اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ روحانیات کی دنیا میں قربِ حق و حسنِ عمل کے معاملہ میں مرد و عورت کی حیثیت مساوی ہے۔ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ اور حج اور بہت سی عبادتیں جس طرح مردوں کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح عورتوں کے لئے بھی۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ مرد و زن کی یہ مساوات و یکسانی دنیوی معاملات میں انتظامی حیثیت سے قائم نہیں۔ دونوں بہ حیثیت عبد بالکل ایک ہیں۔ اعمال کی قبولیت کے باب میں عنداللہ بالکل ایک ہیں لیکن دنیا میں شریعت کا حکم ہے کہ باپ افسر ہوکر رہے، اور بیٹا ماتحت ہوکر، وہ حکم دے اور یہ حکم مانے، اب بتایا جارہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و تفوق حاصل ہے۔ "قَوَّام" کے معنی ہیں کسی شے کے محافظ منتظم، سربراہ ہونے کے، مراد یہ ہے کہ عورتوں کے امور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے، اور احکام کے نافذ کرنے والے ہیں۔

بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ان عبارتوں سے کیجئے جو ابھی پڑھ کر سنا رہا ہوں :۔

"خداوند خدا نے...... عورت سے کہا اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا

اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا" (پیدائش باب ۳، آیت ۱۶)

یہ عبارت عہد عتیق کی تھی یعنی توریت کی۔ اب جدید یعنی انجیل کی بھی سنیئے:۔

"اے بیویو! اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسی خداوند کی،
کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے، جیسے مسیح کلیسا کا سر ہے، اور وہ خود بدن کا
بچانے والا ہے، لیکن جیسے کلیسا مسیح کا تابع ہے ایسے ہی بیویاں ہر بات
میں اپنے شوہروں کی تابع ہوں" (افسیون باب ۵، آیات ۲۳-۲۴)

قرآن حق کا کلام ہے اور ہمیشہ حق ہی کہتا ہے، وہ کلیسا کی کونسلوں اور منوسمرتی کی طرح عورت کی تحقیر و تذلیل کا ہرگز قائل نہیں، لیکن ساتھ ہی جاہلیت قدیم اور جاہلیت جدید سے بھی ہمدردی نہیں۔ وہ عورت کو ٹھیک وہی مقام دیتا ہے جو فاطر کائنات نے اسے نظام کائنات میں دے رکھا ہے۔ بہ حیثیت ایک عبد اور مکلف انسان کے وہ مرد کے مساوی اور ہم سطح ہے لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے ماتحت و تابع ہے۔

آخر میں بہ طور اسباب قرآن نے دو باتیں بیان کی ہیں، ایک یہ کہ مرد کو عورت پر فوقیت طبعی و تکوینی پہلو سے حاصل ہے۔

بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ، اور مرد کی یہ افضلیت اس کے قوائے جسمانی کی مضبوطی اور دل و دماغ کی برتری کے باعث ہے۔ اور دوسرے یہ کہ مرد جو عورت کو مہر اور نفقہ کے سلسلے میں خرچ کرتا رہتا ہے۔

بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ، یعنی مرد کو افضلیت دہری حاصل ہے۔ ایک تو طبعی یعنی جسمانی و دماغی قویٰ میں خلقی برتری کے باعث دوسرے قانونی یا معاشرتی۔ یعنی عورت خرچ میں مرد کی دست نگر رہتی ہے۔ یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ قرآنی نظام میں کمانا یا کسب معاش کرنا یا بیوی کے خرچ کا بار اٹھانا مرد کے ذمہ ہے۔ قرآن اس

نظامِ معیشت کو پسند نہیں کرتا، جس میں کما کر لانے کی راہیں میاں، بیوی دونوں کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہوں۔

۴۱

اس سیاق میں قرآن نے اسے بھی کھول کر بیان کر دیا ہے کہ وہ اسلامی معاشرہ میں کس قسم کی بیویاں خاتونیں چاہتا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (آیت ۳۴)

سو نیک بیویاں اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں اور پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں اللہ کی عنایت سے،

سب سے شروع میں جو حرف ف آیا ہے یا بے معنی نہیں۔ ف کے معنی ہیں "نتیجۃً" یعنی اور اوپر کے مقدمات سے یہ نتیجہ لازم آجاتا ہے کہ وہ نیک بیویاں ایسی ہوں کہ کیسی ہوں؟ پہلی بات یہ کہ وہ اللہ کی فرمانبردار اور عبادت گزار تو ہوتی ہیں شوہروں کی بھی فرمانبردار و اطاعت گزار ہوں۔ مساوات کے نعرے لگانے والیاں نہ ہوں۔ اور دوسری بات یہ ہوتی ہے کہ شوہروں کی غیبت میں ان کی عزت و ناموس کی اور ان کے مال و اولاد کی حفاظت کرنے والیاں ہوں۔

یہ حال تو ہوا شریف، شائستہ، مہذب بیویوں کا، جیسا کہ ہونا چاہیے۔ اب ہیں ناشائستہ اور رذیل فطرت والیاں تو ان کی بھی جھلک دیکھ لیجیے:

وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ج

اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم ان کی سرکشی کا علم رکھتے ہو تم انھیں نصیحت کرو، اور انھیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو اور انھیں مارو،

یہاں آیت میں جو لفظ خوف آیا ہے (تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ) تو یہاں اس سے مراد محض شبہ یا گمان نہیں بلکہ یہ ہے کہ جب ان کی بغاوت و نافرمانی تجربہ میں آجائے ابن عباسؓ صحابی کی تفسیر خوف، بمعنی علم آیا ہے۔ تخافون ای تعلمون اور دوسرے اہلِ تفسیر بھی اسی طرف گئے ہیں کہ محض بدگمانی کافی نہیں، بلکہ واقعی تجربہ قصور کا ہولے۔ اور نشوز کے معنی یہ ہیں کہ بیوی شوہر کی نافرمانی پر کمربستہ ہوجائے۔ جب پُرمسرت ازدواجی زندگی کا گھر بغاوت، و تصادم کا تماشا گاہ بن جائے، تو اس وقت کے لئے پہلا حکم ہے کہ عِظُوهُنَّ انھیں سمجھاؤ، وعظ و پند سے کام لو، عورت اگر شریف طینت ہے تو یقین ہے کہ اس نرمی و آشتی کے طریقے سے اصلاح پر آجائے گی، اور اس ضمن میں یہ ہدایت بھی مل گئی کہ غصہ میں آکر کوئی فوری کارروائی نہ کر بیٹھو۔ لیکن جب یہ تدبیر کارگر نہ ہو تو اب عملی قدم یہ اُٹھاؤ کہ ترک ہم بستری کرو۔ بلکہ هجر کے معنی یہاں ابن عباسؓ صحابی اور متعدد تابعین سے ہجر الکلام منقول ہیں۔ یعنی ترک کلام۔ ان سے بولنا چھوڑ دو، اور جب سزا کا یہ دوسرا درجہ بھی ناکام رہے، تو انھیں جسمانی آزار پہنچا سکتے ہو۔ یہ آخری تدبیر صرف آخری درجہ میں ہے۔ جب پہلے دونوں علاج تجربہ کے بعد ناکام ثابت ہولیں۔ اور اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکے قسم کی ہو جس سے نہ چوٹ زیادہ آئے اور نہ اس سے رفیق زندگی کی توہین لازم آئے۔

بلکہ مفسر صحابی ابن عباسؓ کی تو رائے ہے کہ یہ مار مسواک کی سی ہلکی پھلکی چیز سے ہو۔ قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار یاد کرلینے کی ضرورت ہے۔) کسی ایک طبقہ سے، کسی ایک بلندی ترقی۔ پر پہنچی ہوئی قوم سے نہیں، اس کے مخاطب ایک ہی وقت عرب و عجم بھی، اور حبشی و مصری بھی، ہندی و چینی بھی، امریکی و افریقی بھی، بڑے سے بڑے شریف بھی اور انتہائی رذیل بھی، چمار اور چوہڑے بھی، عالم و فہیم بھی، جاہل و کودن بھی، ہر طبقہ، ہر ذہنیت، ہر اخلاقی و عقلی سطح کے لوگ

پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک، ہر زمانہ اور ہر سطح تمدن والے ہیں، اور اس لئے اس کے احکام میں احاطہ ہر انسانی اور ہر بشری ضرورت کا کرلیا گیا ہے اور یہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ایسے طبقے اور معاشرے موجود ہیں جہاں عورت کے لئے گالی گلوج اور جسمانی سزائیں عام ہیں۔ مار پیٹ کوئی نادر الوقوع واقعہ نہیں، پھر انہیں بھی اس کی اجازت ضرورت پڑنے ہی پر ہے۔ فقہائے اُمت نے صاف کہہ دیا ہے کہ نرم تدابیر اگر کام دے جائے تو سخت صورت کی اجازت نہیں۔ اور قرآن مجید کا سیاق بھی نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے۔ یورپ میں جہاں میاں بیوی کی مار پیٹ کا رواج ہے۔ اس کا ذکر خاکسار کی انگریزی تفسیر میں موجود ہے۔ قرآن مجید میں اس اجازت کا موجود ہونا ہرگز اس کے حق میں مضر نہیں بلکہ یہ تو عین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ، ہر مزاج، ہر سطح انسانی کے لئے تھے اور ہیں۔

﴿ ۴۲ ﴾

مصلوبیت مسیحؑ کی بحث قرآن مجید کی اہم بحثوں میں ہے۔ اور مسیحیت کے عقیدہ واختلاف نے اسے اہم تر بنا دیا ہے۔ اس کے سمجھنے اور گتھی کے پوری طرح سلجھنے میں ذرا وقت لگے گا۔ لیکن یہ وقت ان شاء اللہ ضائع نہیں ہوگا۔ بس ذرا صبر و توجہ سے سماعت فرمائیں۔

قرآن مجید نے اسے کسی مستقل عنوان کے ماتحت نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی ایک لمبی فہرست جرائم میں محض ضمناً بیان کر رہا ہے۔ اور پورا مضمون ایک آیت میں نہیں، دو تین آیتوں میں آیا ہے۔ سورۃ النساء کا بائیسواں رکوع کھول کر ملاحظہ کیجئے، دو لمبی آیتوں میں قوم اسرائیل کی تاریخی نافرمانیوں اور مسلسل سنگین جرموں کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۪ (آیت ۱۵۵)

سو ہم نے انھیں سزا میں مبتلا کیا، بہ سبب ان کی عہد شکنی کے، اور بہ سبب آیات الٰہی سے ان کے کفر کے، اور بہ سبب ان کے خون ناحق انبیاء کے اور بہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں (نہیں) بلکہ ہے یہ کہ اللہ نے ان پر مہر لگا دی ہے یہ بہ سبب ان کے کفر کے، سو وہ ایمان نہیں لائے مگر بہت تھوڑا سا۔

اور وہ تھوڑا سا ایمان، ناقص، نامکمل، لغوی معنی میں جو ہے، وہ مرتبہ ایمان شرعی کے لئے کافی نہیں۔

وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۙ (آیت ۱۵۶)

اور بہ سبب ان کے کفر کے اور بہ سبب ان کے قول کے مریم پر بہتان عظیم کے۔

یعنی اور سب تو ان کی نافرمانیاں چل رہی تھیں، اب اس میں اضافہ انھوں نے یوں کیا کہ اس پاک سرشت مریم بنت عمران پر ایک سخت گندہ الزام لگا دیا، قرآن مجید نے اس گندہ الزام کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا، باقی یہود کی کتابوں میں تو اس شرمناک جرم کی صراحت آج تک لکھی چلی آ رہی ہے۔ یہود کی لکھی جو قدیم ترین حیات مسیح کے نام سے عبرانی میں موجود ہے، اس کا انگریزی ترجمہ According To Hebrews کے نام سے چھپ چکا ہے، اس میں اس رومی سپاہی کا نام تک دیا ہے جس کے ساتھ نعوذ باللہ آپ کو متہم کیا ہے اور یہ نام بیسویں صدی کی ایک کتاب جوزف کلازنر Klausner کی LIFE OF JESUS تک میں نقل ہوا ہے۔

والدۂ مسیح پر بہتان عظیم کے بعد قرآن مجید کہتا ہے ان کی مسلسل سزایابی کے لئے کہ

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ (آیت ۱۵۷)

اور بہ سبب ان کے اس قول کے کہ ہم نے عیسٰی ابن مریم کو مار ڈالا جو اللہ کے پیمبر تھے۔

اس وقت یہود اس کو اپنی ہی جانب منسوب کرتے تھے، اور اس کو اپنا ایک پُر فخر کارنامہ سمجھتے تھے۔ حکومت اس وقت ملک پر گو یہود کی نہیں، رومیوں کی تھی۔ فوجداری عدالتیں بھی انھیں کی تھیں، سزا دینے اور سولی پر چڑھانے کا اختیار بھی یہود کو نہیں، انھیں کو تھا، یہود تو عام رعایا کی طرح تھے۔ لیکن قرآن مجید نے یہ قول منسوب انھیں کی جانب کیا۔ مقدمہ عدالت میں یہود ہی لائے۔ گواہ استغاثہ کی طرف سے یہود ہی پیش ہوئے، اور آپ کو سزا دلوانے میں پوری سعی یہود ہی نے کر ڈالی، بلکہ جب سزا دینے میں رومی حاکم عدالت پیلاٹس Pilate مذبذب ہونے لگا تو شور و شر اسی کے خلاف برپا کر کے اسے سزائے موت سنانے پر مجبور کر دیا۔

انجیل متی میں ہے:

"جب پلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ اُلٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں راستباز کے خون سے بَری ہوں، تم جانو۔ سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اولاد کی گردن پر، اس پر اس نے براباکو ان کی خاطر چھوڑ دیا۔ اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے۔" (باب ۲۷، آیات ۲۴-۲۶)

اس سے ملتے جلتے بیان انجیل مرقس وغیرہ کے ہیں، اور انجیل لوقا میں تو یہ تصریح بھی موجود ہے کہ:-

"مگر پلاطس نے یسوع کو چھوڑنے کے ارادے سے پھر ان سے کہا، لیکن

وہ چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دے، صلیب! اس نے تیسری بار ان سے کہا، کیوں؟ اس نے کیا برائی کی، میں نے قتل کی کوئی وجہ نہیں پائی اور میں اسے پٹوا کر چھوڑے دیتا ہوں۔ مگر وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے، ان کا چلانا کارگر ہوا۔ پلاطس نے حکم دیا کہ ان کی مرضی کے موافق ہو ...... یسوع کو ان کی مرضی کے موافق سپاہیوں کے حوالہ کیا۔" (باب ۲۳، آیات ۲۱ تا ۲۵)

اور انہیں یہود سرداروں اور عالموں ہی نے تو مسیح کو عدالت تک پہنچایا تھا۔

انجیل مرقس میں ہے:۔

"اور فی الفور صبح ہوتے ہی سردار کاہنوں نے بزرگوں اور فقیہوں اور سارے عدالت والوں سمیت صلاح کر کے یسوع کو بندھوایا اور لے جا کر پلاطس کے حوالہ کیا"۔ (باب ۱۵، آیت ۱)

اور خود انجیلوں میں جو پیش خبریاں حضرت مسیح کی زبان سے اپنے قتل یا شہادت کی بابت ہیں، ان میں بھی سبقت اور پیش قدمی یہود ہی کے سرداروں کی دکھائی ہے، رومی یا رومی حکومت کا نام بھی نہیں لیا ہے۔

انجیل متی میں ہے:

"اس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ میں یروشلم کو جاؤں، اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں" (باب ۱۶، آیت ۲۱)

اور انجیل مرقس میں ہے:۔

"پھر وہ انہیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار اور فقیہ اسے رد کریں اور اسے قتل کیا جائے" (باب ۸ آیت ۳۱)

اور انجیل لوقا میں ہے:۔

"ضرور ہے کہ ابن آدم دکھ اٹھائے، بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اسے رد کریں اور وہ قتل کیا جائے"۔ (باب ۹- آیت ۲۲)

تو در حقیقت یہ قرآن کی انتہائی حقیقت سنجی کا ثبوت ہے کہ اگرچہ مقدمہ پیش ہوا رومی عدالت میں اور رومی ہی عدالت نے آپ کو سزائے موت کا حکم سنایا، لیکن قرآن مجید نے مجرموں میں صرف یہود کا لیا کہ حقیقت میں ان ہی کا ہاتھ قدم قدم پر کام کر رہا تھا۔ یہود کا فخریہ قول کہ "ہاں ہم ہی نے عیسٰی بن مریم کا کام تمام کر ڈالا" ابھی ابھی نقل ہوا ہے اب دیکھیئے قرآن ان کے اس قول پر کیا تبصرہ کرتا ہے،

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ

"حالانکہ وہ نہ آپ کو مار ڈال سکے، نہ آپ کو سولی پر چڑھا سکے، بلکہ ان پر شبہ ڈال دیا گیا"۔

یعنی آپ کا کام تمام کر ڈالنا تو الگ رہا (وَمَا قَتَلُوهُ) وہ تو آپ کو سولی پر بھی چڑھا نہ پائے۔ (وَمَا صَلَبُوهُ) اور اس آخری فقرہ کے اگر یہ معنی لیئے جائیں کہ "آپ کو سولی پر نہ مار سکے" تو آپ کی ہلاکت کی نفی سرے سے پہلے ہی فقرہ میں کر دی ہے تو یہ دوسرا فقرہ صلیب پر مار نہ سکے بالکل بے کار یا حشو ہوا جاتا ہے یعنی جب آپ کسی کو کسی طرح نہ مار سکے تو اس میں سولی دینا بھی شامل ہو گیا۔ پھر اب اس کے دہرانے کی کیا ضرورت تھی، اور قرآن مجید حشو سے بالکل پاک ہے۔ صَلَبُوهُ کا اصل مفہوم محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کا ہے۔ چڑھا کر ختم کر دینے کا نہیں۔ امام لغت راغب کے مفردات میں ہے تعليق الانسان للقتل انسان کو ہلاکت کے لئے لٹکا دینا اور اردو میں یہ مفہوم "سولی دینے" سے نہیں "سولی پر چڑھانے" ہی سے ادا ہوتا ہے۔ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور حضرت تھانویؒ کے اردو ترجموں میں اس کی رعایت موجود ہے۔

حضرت مسیح کے ملک اور زمانے میں سرکاری سزائے موت کے لئے طریقہ ہی صلیب پر چڑھانے کا نافذ تھا۔ تو قرآن کہتا ہے کہ یہود آپ کو ہلاک تو کیا کرتے، سولی پر چڑھانے پر بھی قادر نہ ہو سکے۔ بلکہ دھوکے میں پڑ گئے۔ اور حقیقت ان پر مشتبہ ہو گئی۔ یہ شبہ میں کیوں پڑ گئے؟ یا حقیقت کس پر مشتبہ و مختلط ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ وہی یہود یا بنی اسرائیل مراد ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے۔ مدارک میں ہے وقع علیہم الشبہ اور بیضاوی میں ہے التبس علیہم الامر۔ یا یوں کہا جائے کہ شبہ انھیں مقتول سے متعلق ہوا یا اس کی شخصیت کے بارے میں وہ دھوکے میں پڑ گئے۔ جلالین میں ہے شبہ لھم المقتول والمصلوب۔

قرآن نے اس اشتباہ یا التباس کو خوب ہی مؤکد کیا ہے، اور نفی ہلاکت کو ایک بار پھر صراحت سے دہرایا ہے:

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ یَقِیْنًا ۙ (آیت ۱۵۷)

اور جو لوگ آپ کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں اور آپ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس کوئی علم (صحیح تو ہے) نہیں۔ ہاں بس یہ گمان کی پیروی ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپ کو ہلاک نہیں کیا۔

غرض اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ دھوکا یہود کو ہوا اور وہ حضرت مسیح کے بجائے کسی اور کو سولی پر دے گئے۔ یہ شخص کون تھا؟ اور اس دھوکے کی کیا صورت ہوئی، اور ایک بڑے مجمع کے سامنے یہ دھوکا ممکن کیونکر ہوا؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے، نہ حدیث صحیح میں۔ سادہ دل مسلمان کو تو محض اس صورت حال پر جو کہ یہاں بیان ہوئی ہے، ایمان لے آنا کافی ہے اور چون و چرا میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن آج کے طالب علم کو جو فکر کیسے اور کیونکر کی پیدا ہو گئی ہے

اس کی تسکین کے لئے لازمی ہے کہ اس تاریخی گرہ کا جواب تاریخ ہی کی روشنی میں دیا جائے۔ واقعہ کے ایک ایک جزئیہ کو سامنے لے آیا جائے۔ اور جو صورت واقعہ نسبتہً زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال ہو۔ اس کو اللہ کا نام لے کر ترجیحی طور پر اختیار کرلیا جائے۔ کڑی کا سلسلہ کڑی سے اُلجھنے نہ پائے۔ اس کے لئے کچھ دیر کے صبر و سکوت کی درخواست ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو اس سلسلے میں یاد رکھنے کی یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے۔ آپ کی کم آمیزی کا نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کے وقت اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا گروہ شناخت کے لئے کافی ثابت نہ ہوا، بلکہ آپ کی شناخت کے لئے آپ ہی کی مختصر پارٹی سے ایک غدار کو توڑ لینا پڑا۔ یہ حقیقت ہے تو خالص تاریخی، لیکن کرامت دیکھیے کہ آپ کے امام المفسرین امام رازیؒ (جن کا زمانہ ساتویں صدی ہجری کے شروع کا ہے) اس راز سے واقف نکلے، چنانچہ لکھتے ہیں:

والناس ماکانوا یعرفون المسیح الا بالاسم لانه کان قلیل المخالطة بالناس (کبیر)

لوگ حضرت عیسیٰ کو تو بس نام ہی سے جانتے تھے۔ ان کی کم آمیزی کی بنا پر۔

متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لئے انھیں یہودا منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یہ

"یسوع نے ان سے پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو تو وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا کہ میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں ہی ہوں" (باب ۱۸ آیات ۳ تا ۸)

حضرت مسیح کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے، معاصر مخالفین و معاندین کے نزدیک تو آپ کی حیثیت بس ایک بدنام و غیر متعارف مجرم کی تھی، وہ سامنے موجود تھا، اور اپنے کو چھپا بھی نہیں رہا تھا۔ ظاہر کر رہا تھا۔ اس پر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

(۲) دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ بہ طور خرق عادت یا بطور کمال فن حضرت کو تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں اس خصوصیت کو بہ طور معجزہ بیان کیا گیا ہے۔ انجیل متی میں ہے:

"چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر لے گیا۔ اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا" (باب ۱۷، آیت ۱-۲)

اور انجیل لوقا میں ہے:-

"جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرے کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی"۔ (باب ۹، آیت ۲۹

(۳) تیسرے اس حقیقت کا بھی استحضار کر لیا جائے کہ ملک فلسطین کی آبادی، اس وقت اسرائیلیوں (یہود) کی تھی۔ عام رعایا یہی لوگ تھے۔ لیکن ملک کی حکومت رومیوں کی تھی۔ اور عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی، اور رومی نہ صرف مذہباً مشرک تھے، عقیدے میں اسرائیلیوں سے مختلف، بلکہ شکل و شمائل، قیافہ اور چہرہ مہرہ، وضع و لباس، زبان و معاشرت ہر چیز میں یہود سے ایسے ہی مختلف تھے جیسے ابھی کل تک انگریز ہندوستان میں رہنے کے باوجود، ہندوستانیوں سے تھے۔ اور جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے یکساں معلوم ہوتے تھے، اور جس طرح گوروں کو سارے کالے ایک سے نظر آتے تھے، اسی طرح سب بدیسی رومیوں کو کل اسرائیلی ایک ہی سے

دکھائی دیتے تھے۔

(۴) اب چوتھی کڑی اس سلسلے میں یہ ملائیے کہ جس مقام پر عدالت تھی وہاں سے سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی کے بڑے حرف T یا ریل کے سگنل سے مشابہ ہوتی تھی۔ یہ پوری اس سولی گھر میں گڑی نہیں ہوتی تھی۔ صرف اسکی سیدھی لمبی کھڑی بلّی سولی گھر میں گڑی رہتی تھی۔ اور جو لکڑی اس کے اوپر عرض میں آڑی پڑتی تھی۔ وہ وہاں نہیں، بلکہ عدالت میں رکھی رہتی تھی۔ اور دستور یہ تھا کہ اسے خونی مجرم اپنی پیٹھ پر لاد کر سولی گھر تک لاتا۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا، اسے پوری طرح ذہن میں رکھ کر صورت واقعہ نظر کے سامنے لائیے۔ اور آگے پڑھیے۔

وہ دن جمعہ کا تھا (GOODFKIDAY کا تہوار آج تک اس کی یادگار میں منایا جاتا چلا آرہا ہے) حکم جب سنایا گیا تو دن آخر ہو رہا تھا۔ یہود کو جلدی تھی کہ جس طرح بھی بن پڑے ہر طرح فراغت پاکر اور مجرم کو دفن کرکے شاموں شام گھر واپس پہونچ جائیں۔ ان کا یوم السبت جمعہ کی شام ہی سے شروع ہوجاتا تھا اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی و تدفین وغیرہ بالکل ممنوع تھی۔ اور پھر یہود کا اہم تر تہوار عید فسح (Passover) بھی شروع ہونے کو تھا۔ غرضکہ یہود کو اس کی بڑی عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا مجرم جلد سے جلد سولی پاکر شام سے قبل ہی دفن ہوجائے۔

ناتوان ولاغر مجرم (حضرت مسیح) کے لئے ممکن نہ تھا کہ پشت پر اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کرسکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور خود یہود انھیں قدم قدم پر چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے۔ انجیل متی۔ مرقس دونوں میں ہے کہ راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر ان پر لعن وطعن کرتے۔ بلکہ دو ڈاکو مجرم جو ساتھ تھے وہ بھی اس میں شریک رہے۔

اس ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ نظر کے سامنے لا کر خود سوچئے کہ رومی سپاہی جو حاکم قوم کے افراد تھے اور مجرم کو اپنی حراست میں لئے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس موقع پر کیا کیا ہو گا ہ ــــــ خود اپنے اوپر تو وہ بلّی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انھوں نے وہی کیا جو ایسے موقع پر کوئی ان کا سا انسان کرتا۔ انھوں نے راہ ہی میں کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب والی لکڑی اس پر لاد دی۔ یہ محض قرینہ و ظن و قیاس نہیں۔ انجیلوں میں اس کی تصریح ملتی ہے۔

"انھیں شمعون نامی ایک کرینی آدمی ملا۔ اسے بیگار پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے"۔

(متی باب ۲۷، آیت ۳۱)

ایک حوالہ یہ ہوا، دوسرا اور لیجئے:۔

"اور شمعون نامی ایک کرینی آدمی، سکندر اور روفس کا باپ، دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انھوں نے اس کو پکڑ لیا کہ اسکی صلیب اٹھائے" (مرقس ۱۶: ۳۱)

تیسرا حوالہ اور ملاحظہ ہو:

جب اس کو لئے جاتے تھے، تو انھوں نے شمعون نام ایک کرینی جو دیہات سے آتا تھا پکڑ لیا، صلیب اس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے (لوقا ۲۳: ۲۶)

اچھا، اب جب یہ عوام الناس کا ہجوم اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ خانی کرتا، اس سے تمسخر کرتا، سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا، تو رومی پولیس کا جو گارد ہمراہ تھا، اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ اب عمل دخل جیل کے وارڈوں سنتریوں کا شروع ہوا۔ وہ کیا جانے کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے، خدائی یا پیمبری کا دعویدار کون ہے۔ وہ مجرم حسب دستور، اس کو سمجھے، جس کی پشت پر صلیب لدی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر اس نفسیاتی حقیقت کا استحضار کر لیجئے کہ جیل کے رومی، سنتریوں کے لئے سب اسرائیلی اجنبی ہی تھے۔ اور اس لئے سب آپس میں ہم شکل، ان کے لئے ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی

(شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ بالکل قدرتی تھا۔ انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق محسوس ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا، لیکن اِدھر ہجوم کا شور و ہنگامہ، اُدھر رومی سنتریوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سولی پر چڑھا دینے کی جلدی، اس افراتفری کے عالم میں شمعون اسرائیلی کو مجرم سمجھ کر سولی پر چڑھا دیا گیا۔ وہ چیختا چلاتا رہا۔ اور حضرت مسیح اس ہڑبونگ میں یقیناً رہا ہوگئے، اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے وَلٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ کی تفسیر اس سے بڑھ کر روشن تر اور کیا ہوگی۔

آخر میں یہ بھی سُن لیجئے کہ یہ عقیدہ بالکل نوایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم فرقہ باسلیدیہ (Basildian)۔ (بانی فرقہ کا سال وفات سنہ ۱۳۰ء) اس عقیدہ کا قائل ہوا ہے، اور کھلم کھلا کہتا تھا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔

قرآن مجید اس عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ لیکن پولوس (متوفی سنہ ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی، اس کی بنیاد ہی عقیدۂ کفارہ پر ہے یعنی اس پر کہ ابن اللہ نے، یا خود خدا نے مجسّم ہوکر، اور مصلوب ہوکر جانکنی کی تکلیف اٹھاکر، اور اپنی جان دے کر ساری گنہگار مخلوق کی طرف سے کفارہ ادا کردیا۔ اس لئے رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی۔ اور اسی لئے لامحالہ اس پولوسی اور تمام تر تثلیثی مسیحیت میں کل قدیم تر اور صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو "مبتدع" و بددین قرار دے کر دائرہ مسیحیت سے الفقط کردیا، اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنان مسیح یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے۔ یعنی کہ عیسیٰ صلیب پر وفات پا گئے۔ گو ظاہر ہے کہ اس اشتراک عقیدہ میں نیتیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں۔ یہود ہلاکت مسیح کو موقع تحقیر و اہانت پر بیان کرتے ہیں، اور مسیحی بجنسہٖ اس واقعہ کو آپ کی عظمت، بلکہ

اُلوہیت پر دلیل لاتے ہیں۔ نفسِ وفات بہر حال دونوں میں مشترک ہے۔

سچ کہا قرآن نے کہ مسیح کے بارے میں یہ لوگ یعنی اہلِ کتاب آپس کے اختلافات میں لپیٹے ہوئے ہیں، کوئی آپ کو عرشِ اُلوہیت پر بٹھائے دیتا ہے اور آپ کی خدائی کا کلمہ پڑھ رہا ہے، کوئی مرتبۂ نبوت بلکہ ولایت و مقبولیت سے بھی نیچے اُتار لاتا ہے اور آپ کو نعوذ باللہ شعبدہ باز قرار دے رہا ہے اور قرآن نے یہ جو آپ کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ۔ تو شَكٍّ کی بہترین تفسیر مفسر تھانوی نے کی ہے: قول بلا دلیل، یہ قول بلا دلیل ہی کی برکت تو ہے کہ نظریہ پر نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں، اور کوئی بات بنائے نہیں بنتی۔ مسیحی مسیحیوں سے دست و گریبان ہیں، اور یہود یہود سے۔ دیکھتے دیکھتے، اندر ہی اندر خدا معلوم کتنے فرقے نکل آئے ہیں، ایک دوسرے کو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔

"چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند"

اسی موقع کے لئے ہے۔ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ، اور علم سے مراد علم ثابت بالدلائل ہے۔ تحقیق سے تہی دستی کی مثال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ نہ کوئی نص اسکی خیال آرائیوں کی پشت پر ہے، نہ کسی نص سے استنباط صحیح ــــ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ: ظن یہاں مقابل میں علم کے ہے۔ یعنی کوئی دلیل نہ عقلی نہ نقلی۔

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا۔ مدارک سے لے کر جلالین تک سب کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ فقرہ نفیِ قتل و ہلاکت کی تاکید کے لئے ہے۔ چوں کہ عقیدۂ وفاتِ مسیح یا قتلِ مسیح بہت بڑی گمراہی کا باعث ہے۔ اور دنیا کے دو بڑے مذہب مسیحیت اور یہودیت اسی غلط عقیدہ میں پڑے ہوئے ہیں، اس لئے قدرتاً قرآن کو ضرورت بھی اسکی تردید کی، اس وضاحت و تاکید کے ساتھ، پیش آئی۔

---

(۴۳)

قرآن مجید نے عقیدہ کے سلسلہ میں بڑا زور تسلسل وحی پر دیا ہے، یعنی اسلام دنیا کے لئے کوئی جدید یا نو پیدا مذہب نہیں ہے۔ اور نہ رسول اسلام دنیا میں پہلے شخص ہیں جن پر وحی آئی ہے۔ بلکہ نزولِ وحی کا سلسلہ دنیا میں بہت قدیم سے چلا آرہا ہے، اور دنیا کے مختلف حصوں میں اور مختلف زمانوں میں پیمبر برابر پیدا ہوتے ہی رہے ہیں، جنھوں نے اللہ کے کلام کی منادی کی ہے، اور اللہ کا کلام بندوں تک پہنچایا ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ نساء میں بڑے زور اور صفائی کے ساتھ اس مضمون کو بیان کیا ہے، اور نبیوں کے نام تک صراحت سے دے دئیے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿آیت ۱۶۳﴾

یقیناً ہم نے آپ پر (اے پیمبر) وحی بھیجی، جیسی وحی ہم نے بھیجی نوح اور اُن کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی، اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب اور عیسٰی اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان پر بھیجی۔ اور ہم نے داؤد کو ایک صحیفہ دیا تھا۔

روئے سخن زیادہ تر یہود ہی کی جانب ہے اور عقلاً حجت انھیں پر قائم کی ہے کہ جب تم حضرت نوحؑ کے بعد بہت سے نبیوں کو جانتے ہو اور مانتے ہو، اور نظامِ وحی کے پوری طرح قائل ہو، تو ایک نئے نبی کی شناخت ومعرفت سے تمھیں اتنی وحشت اور دشواری کیوں ہو رہی ہے۔ نبیوں کے نام لینے کے بعد ذکر ہے:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ (آیت ۱۶۴)

اور دوسرے پیمبروں پر بھی وحی بھیجی تھی کہ ان کا حال ہم آپ سے پیشتر بیان کر چکے ہیں، اور ایسے پیمبروں پر بھی کہ ان کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا، اور موسیٰ سے اللہ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔

اس میں اس بات کا اثبات ہے کہ ایسے پیمبر بھی ہوئے ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے۔ اور یہیں سے یہ مسئلہ ہمارے متکلمین نے اخذ کیا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ نام بہ نام ایمان لانا ضروری نہیں، بلکہ سب نبیوں کی اجمالی تصدیق ضروری ہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس انداز کے ساتھ آیا ہے یعنی فعل، کے بعد پھر اسی مصدر کو لانا، وہ بھی تنوین کے ساتھ، عربی کے اسلوب بلاغت کے مطابق، اس سے کلام کی کوئی خاص حیثیت اور خصوصیت رکھتا تھا۔ ورنہ محض کلام و مخاطبہ تو عام معنی میں ہر ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہی ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۚ (آیت ۱۶۵)

پیمبروں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) تاکہ لوگوں کو پیمبروں (کے آنے کے) بعد اللہ کے پاس عذر باقی نہ رہ جائے، اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست، بڑا حکمت والا۔

ان پیمبروں کے آنے کی غرض و غایت یہی معلوم ہوتی ہے کہ نیکی اور اجر و ثواب کے، اور بدی و عذاب کے راستے لوگوں کے علم و نظر میں رکھیں، اور وحی الٰہی کی روشنی میں انھیں وہ درس دیں جہاں تک عقل و دماغ کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور پیمبروں کے آجانے کے بعد اب کسی کو قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ رہا کہ ہماری عقل مسائل و حقائق کے سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور متکلمین نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بندوں پر حجت، اللہ کی طرف سے

ارسالِ رُسل اور بعثتِ انبیاء کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرد عقل و فہم کی بنا پر۔ چنانچہ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اسے تکرار کے ساتھ لکھا ہے۔

اور اخیر آیت میں جو دو خطاب الٰہی عَزِیْزٌ و حَکِیْمٌ آئے ہیں، تو یہ یاد دلانے کے لئے کہ وہ عزیز یا غالب کل تو، مالک و مختار اور فاعل حقیقی کی حیثیت سے حق اور اختیار رکھتا تھا کہ پیغمبروں کے بھیجے بغیر ہی، ہر عذر قطع کر دیتا۔ لیکن اس حکیم کی شانِ حکیمانہ نے یہ چاہا کہ وہ ظاہری عذر بھی باقی نہ رہنے دے۔

(۴۴)

یہود کے ذکر سے فارغ ہو کر ختم سورہ کے قریب ایک بار پھر، اثباتِ توحید و تردیدِ تثلیث کے مضمون کو، زور و قوت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہود جس طرح تفریط کے مریض ہیں، عیسائی افراط کی انتہا پر پہونچ گئے تھے۔ اور حضرت عیسیٰ مسیح کو بجائے ایک صالح اور مقبول برگزیدہ پیمبر کے، خدائی کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ ۚ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْہُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ ؕ اِنْتَھُوْا خَیْرًا لَّکُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَہٗٓ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ وَلَدٌ ۘ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝ (آیت ۱۷۱)

اے اہلِ کتاب، دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کے بارے میں کوئی بات

حق کے سوا نہ کہو، مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے ایک پیمبر ہی ہیں اور اس کا کلمہ جسے پہنچا دیا تھا اللہ نے مریم تک، اور ایک جان ہیں اس کی طرف سے بس اللہ اور اس کے پیمبروں پر ایمان لاؤ، اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں (اس سے) باز آجاؤ، تمہارے حق میں بہتر ہے، اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے، وہ پاک ہے اس سے کہ اس کے بیٹا ہو۔ اُس کا ہے، جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہی کا، کارساز ہونا کافی ہے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ (آیت ۱۷۲)

اور مسیح ہرگز اس سے عار نہ کریں گے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں اور نہ مقرب فرشتے۔ اور جو کہ اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا، اللہ سب کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

اپنے دین میں غلو نہ کرو، یعنی افراط نہ تفریط۔ ٹھیک صراط مستقیم پر قائم رہو۔ مرشد تھانویؒ فرماتے تھے جس طرح یہود کا غلو۔ احکام ظاہری میں تعمق تھا، اور مسائل باطنی کی طرف سے اعراض ہو اسی طرح عیسائیوں کے غلو میں، مسائل باطن میں تعمق اور ظاہر کی طرف سے اعراض۔ طریق حق، ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے۔

اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو یعنی الوہیت کے باب میں کوئی فیصلہ اپنی رائے سے گڑھ کر نہ پیش کرو۔ اور توحید میں کوئی شائبہ بھی شرک کا نہ آنے دو۔ اور مسیح ابن مریم کی حقیقت بھی بس اسی قدر ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول تھے، جیسے اور بہت سے رسول گزر چکے ہیں، نہ کہ خدا، یا مظہر خدا، یا فرزند خدا۔ اللہ کے رسولوں اور اس کے بھیجے ہوئے قاصدوں کو معبودیت یا نیم معبودیت پر پہنچا دینے کا مرض مشرک

قوموں میں کثرت سے رہا ہے۔ عیسائیوں نے بھی مصری شرک اور یونانی و رومی مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیمبر برحق کو، مظہر خدا اور فرزند خدا قرار دے دیا، رہا ان کا کَلِمَۃُ اللّٰہِ ہونا، تو اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ ان کی پیدائش اللہ کے ایک کلمہ ہی کا نتیجہ ہے، اور خود کلمہ سے مراد کلمہ "کُنْ" ہے۔ جو بہ واسطہ جبرئیل علیہ السّلام حضرت مریم پر القاء ہوا۔

رُوْحٌ مِّنْہُ، یعنی اللہ کی طرف سے اللہ کی بنائی ہوئی ایک روح، جو بہ واسطہ فرشتہ جبریل، اور بلا اسباب ظاہری و مادی، حضرت مریم کے بطن میں مجسّم ہو گئے۔ اور کلمہ اور روح کا انتساب اللہ کی جانب محض اس تعلق کے شرف و عظمت، کے اظہار کے لئے ہے۔ جیسے خانۂ کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں، حالانکہ اللہ کے گھر سب ہی ہیں۔ قرآن ہی میں ایک ترکیب نِعْمَۃً مِّنَ اللّٰہِ کی آئی ہے۔ حالانکہ جو نعمت بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے تو ہوتی ہی ہے۔

رُوْحٌ مِّنْہُ سے مراد یہ نہیں کہ اللہ کی روح صرف انھیں میں تھی، اور کسی فرد بشر میں نہیں ہوتی۔ اللہ کی روح تو ہر فرد بشر میں ہوتی ہے۔ نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ قرآن مجید میں مقام تخصیص و امتیاز پر کسی کو عَبْدُہٗ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور کسی کو عبدنا سے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کے بندے سب ہی ہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ، یعنی اللہ کے پیمبروں پر ایمان لاؤ۔ پیمبروں ہی کی تعلیم کے مطابق۔ اور فَاٰمِنُوْا کی ف میں یہ اشارہ ہے کہ ان صحیح حقائق کو سمجھ لینے کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد اور خیالات کو چھوڑ کر، ایمان، اللہ کے رسولوں کی صحیح ہدایات پر لاؤ۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ: تین نہ ٹھہراؤ، اللہ بس ایک ہی ہے۔ نہ تین اقنوم، نہ تین مستقل بالذات ہستیاں۔ تین کسی معنی اور کسی حیثیت سے بھی نہیں۔ تثلیث کا گورکھ دھندا جس طرح عیسائیوں

کتابوں میں درج ہے ہماری آپ کی، شاید سب ہی کی فہم سے بالاتر، وہ انھیں کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ اور اگر آپ سُن چکے ہیں تو دوبارہ سننے کا لطف حاصل فرمائیے۔ سُنئیے:

"باپ، بیٹے، روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر۔ عظمتِ ازلی یکساں۔ جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا، اور ویسا ہی رُوح القدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق، اور روح القدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود، اور روح القدس غیر محدود۔ یوں ہی باپ ازلی، بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی۔"

تاہم تین ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود نہیں، اور نہ تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود۔

باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق۔ تو یہ بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق۔

ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا، روح القدس خدا۔ اس پر تین خدا نہیں، بلکہ ایک خدا"

کہاں توحید کا سادہ عام فہم کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اور کہاں تثلیث کا یہ گورکھ دھندا

خدا کا صحیح رشتہ بندہ کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے۔ مالک و مملوک کے درمیان مُباینت لازمی ہے۔

برخلاف اس کے والد اور مولود کے درمیان مجانست یعنی ہم جنسی وہم نوعی شرط ہے تو جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی بھی مخلوق اس کی اولاد نہیں ہو سکتی۔

اور عقیدۂ ولدیت غلط ہی نہیں بلکہ عقلاً مہمل ہے۔ تنزیہ الوہیت کے لئے باعث توہین اور شانِ الوہیت کے لئے بالکل منافی ہے۔

وَکَفٰی بِاللّٰهِ وَکِیۡلًا، اس حقیقت کے اظہار سے مشرکوں پر یہ سوال قائم کر دیا کہ کیا خدا کو بندوں کی حاجت روائی اور اپنی کارسازی میں کسی کی اعانت کی محتاجی ہے؟

جو وہ کسی کو شریک کرے۔

پھر اگلی اُمت میں ملائکۂ مقربین کا عطف مسیح پر بہت معنی خیز ہے۔ ایک طرف ملائکۂ مقربین اور دوسری طرف حضرت مسیح۔ یہی دو تو دنیا میں کثرت سے پُجے ہیں۔ مشرکوں نے فرشتوں کو دیوی، دیوتاؤں کے نام دے کر شریک الوہیت کر لیا، اور مسیحیوں نے مسیح کو خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ اسی لئے خصوصیت کے ساتھ تصریح ان دونوں کی نفی الوہیت کی گئی۔ اور بتایا گیا کہ اللہ کی عبدیت، کوئی چیز توہین والی نہیں۔ مسیحؑ اور ملائکۂ مقربین تو اس پر فخر کرتے ہیں، نہ یہ کہ اس سے شرمائیں، یا کسی قسم کا بھی ننگ محسوس کریں۔ مرشد تھانویؒ نے اس موقع پر فرمایا کہ مراتب شرف میں عبدیت مرتبۂ اعلیٰ ہے اور بیان کو ختم اس قانون پر کیا ہے کہ اللہ کی بندگی میں کوئی عار محسوس ہی کیسے کر سکتا ہے، جب اللہ ایسا حاکم مطلق ہے، کہ کیا فرشتے اور کیا پیمبر سب ہی کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ہی ہے۔

(۴۵)

سورۂ مائدہ کے چھٹے رکوع کے آخر میں تاکید ہے کہ تقویٰ الٰہی اختیار کرو، اور اس پر اعتماد و توکل اختیار کرو۔ اس کے معاً بعد بنی اسرائیل کا ذکر آتا ہے اور تاریخی استناد کے طور پر بیان ان کے قبیلوں کا ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ (آیت ۱۲)

اور بیشک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں بارہ[۱۲] سردار مقرر کئے تھے، اور ان سے کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

لیکن پہلے تقویٰ کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم یہاں سمجھ لیا جائے۔ قرآن مجید میں بار بار اشارے صراحتیں اس مضمون کی ملتی ہیں کہ دنیوی غلبہ و کامیابی میں بڑا دخل تقویٰ کو رہتا ہے۔

قناعت، بے طمعی، بے نفسی، جذبات پر قابو، صداقت شعاری، عدل، خودداری، غیرت مندی، حفظ حدود، غرض سیرت و کردار کی ساری ہی خوبیاں، کیا انفرادی، کیا اجتماعی، اس ایک جامع لفظ تقویٰ کے اندر آجاتی ہیں۔

اس کے بعد شہادت ایک مُوَحّد قوم بنی اسرائیل کی پیش ہوتی ہے کہ جب تک انھیں اطاعت و فرمانبرداری کے احکام، ان کے پیمبروں کے واسطے سے پہنچائے گئے، ان سے احکام کا عہد لیا گیا، اس وقت تک ان کا عمل بھی ان کے قول کا ساتھ دیتا گیا۔ اور جب انھوں نے عہد شکنی کرنا اپنا شیوہ بنالیا، تباہ و برباد ہوگئے۔

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا، یہ اسرائیلی سردار تعداد میں ان کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق تھے۔ ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک سردار۔ اور توریت کا بیان اس کے بالکل مطابق ہے۔ کتاب گنتی (Numbers) کے پہلے باب میں ہے کہ مصر سے اسرائیلیوں کے نکلنے کے دوسرے برس خدا نے موسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کرکے فرمایا:

> "بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا مطابق ان کے فرقوں کے اور ان کے آبائی خاندانوں کے اسم شماری کے ساتھ ہر ایک مرد سر بسر گن کر حساب کر، اور ہر فرقہ پر ایک ایک آدمی، ہر ایک جو اپنے خاندانوں کا سردار ہے، تمہارے ساتھ ہو"۔ (آیت ۲-۴)

آگے ان سرداروں کے درج ہیں، اور وہ تعداد میں بارہ ہیں۔ اور پھر اسی توریت میں ایک دوسری جگہ کنعان و فلسطین پر فوج کشی سے ذرا قبل کے موقع پر ہے:

> "خداوند نے موسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج، تاکہ کنعان کی زمین کی، جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں، جاسوسی کریں، ایک ایک مرد جو اس کے آبائی فرقہ میں سے، جو اس میں سردار ہے، بھیج دے۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشتِ فاران میں ان کو بھیجا۔ وہ سب لوگ بنی اسرائیل

کے سردار تھے"۔

یہاں بھی سرداروں کی تعداد بارہ ہی درج ہے۔

وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّی مَعَکُمْ: اس شرط اطاعت پر، اس جزاء معیت الٰہی کا ترتب اب کیا بتایا جائے، کہ ایک موحّد و خدا پرست قوم کے لئے کس درجہ ہمت آفریں و شوق افزا ہو سکتا ہے! دل اس کے بعد کس قوی و مطمئن ہو جاتا ہے، اور شکست کا کوئی احتمال بھی اس کے بعد ان کے سامنے نہیں آسکتا۔ آج کوئی وزیر یا گورنر، رعایا کے کسی فرد سے کہہ دے کہ گھبراؤ نہیں، ہم خود تمہارے ساتھ ہوں گے، تو اس کا دل کتنا بڑھ جائے اور کتنا حوصلہ اسے حاصل ہو جائے۔ چہ جائیکہ یہاں خالق کائنات، مالک الملک، حاکم علی الاطلاق، اپنی معیت کا یقین دلا رہا ہے! تسکین و اطمینان کی کوئی منزل اس کے بعد باقی رہ جاتی ہے؟

یہ ایک پہلو تھا، اب دوسرے پہلو سے دیکھیے کہ کیا معصیت بندے کے اس استحضارِ معیت الٰہی کے بعد ممکن ہے؟

کسی بزرگ و مقبول بندہ کی نگرانی تو ہوائے نفس کو روک دیتی اور نفس پر ایک بریک لگا دیتی ہے، چہ جائیکہ ہمہ بیں، ہمہ داں، ہمہ تواں، مالک و مولیٰ کی معیت کا استحضار! غرض ترغیب و ترہیب کے جس پہلو سے بھی دیکھیے، یہ معیت الٰہی کا مراقبہ بہترین و مؤثر ہی ہے۔

یہ ہمارے محققین نے صاف ہی کر دیا ہے کہ معیت سے مراد معیت جسمانی تو ہو ہی نہیں سکتی، جیسی مخلوق مخلوق کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ یہ معیت احاطہ علم و قدرت و تصرف کے لحاظ سے ہے۔

(۴۶)

اور اسی سورۃ المائدہ میں جزم کے ساتھ مسیحیت اور اس کی ایک خاص شکل کی تکفیر، جزم و قطعیت کے ساتھ ہے۔ مسیحیت کی اکثر صورتیں تو کھلے ہوئے کفر و شرک کی ہیں

بعض شاخوں نے اور غلو کر کے یہ مسلک اختیار کر لیا تھا کہ مسیحؑ، خدا، یا مظہر خدا کیسے، وہ تو عین خدا ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (آیت ۱۷)

بے شک وہ لوگ کافر تو ہو گئے جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو عین مسیح ابن مریم ہے۔

اصل مسیحی عقیدہ جو پروٹسٹنٹ و کیتھولک، سارے مسیحی فرقوں میں مشترک ہے۔ ......

.. .. اس کے اصل الفاظ اس خطبہ میں کچھ منٹ قبل آپ سن چکے ہیں، جس میں تینوں اقنوموں کی الوہیت، ازلیت، غیر مخلوقیت، قدرتِ مطلقہ، غیر معبودیت ایک بتائی گئی ہے۔ کیا کوئی شرک اس سے بڑھ کر کھلا ہوا بھی ممکن ہے؟

اب قرآن ان کے اس دعوی پر جرح کر رہا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (آیت ۱۷)

اچھا تو آپ کہئے، کون کچھ بھی بچا سکے ہے، اللہ سے اگر وہ ہلاک کر دینا چاہے مسیح ابن مریم کو، اور ان کی والدہ کو، اور جو کوئی بھی زمین میں ہے ان سب کو۔

ساری ملکیت و مالکیت تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ارادہ میں کوئی بھی حائل و مانع ہو سکتا ہے؟ حتیٰ کہ مسیح بھی اور ان کی والدہ محترمہ بھی، باوجود اپنی صالحیت، مقبولیت اور بلندی مرتبہ کے! اور ساری دنیا مل کر بھی اس کی ملکیت اور مالکیت سے باہر کہیں جا سکتی ہے؟ —— تو جب صورت حال یہ ہے تو اے مسیح پرستو تم کس منہ سے مسیح اور والدۂ مسیح کے شریک الوہیت ہونے کا دعوے کر سکتے ہو؟ ——

مسیح کے ساتھ والدۂ مسیح کا نام یہاں لے آنے کا کھلا ہوا راز یہ ہے کہ مسیحیوں کی ایک بڑی آبادی، کروڑوں کی تعداد میں حضرت بی بی مریم کو بھی خدائی میں حصہ دار یقین کر رہی ہے۔ یہ عقیدہ، عقل اگر بالکل ہی ماری نہیں گئی ہے، تو بجز شرک صریح کے اور کیا ہے؟ اور

اسی عقیدۂ مریم پرستی کے لئے اگر حوالوں کی تلاش ہو تو اس خاکسار کی انگریزی تفسیر کے مطالعہ کی زحمت گوارا فرمائیے۔

اور آگے سنئے ! :

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آیت ۲۰)

اور اللہ ہی کی حکومت ہے، آسمانوں اور زمین پر، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ۔ وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے۔ اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

یعنی ساری موجودات پر اور ساری کائنات پر حکومت، تو اکیلے اسی کی ہے، بلا کسی کی شرکت واعانت کے۔ اور بے اختیاری، بے بسی، اور عجز محض میں، جیسے کل دنیا ویسے ہی حضرت مسیح اور ان کی والدہ بھی۔ اس اعتبار سے اس میں ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ انھیں خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیتے ہو !

آیت کا آخری ٹکڑا معنویت سے لبریز ہے۔ اللہ جو چاہے، اور جس طرح چاہے، پیدا کر دے۔ مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیح کی پیدائش چونکہ بن باپ کے ہوئی ہے، اس لئے انھیں عام بشر یا محض انسان کیسے تسلیم کیا جائے۔ وہ یقیناً مافوق البشر تھے اور الوہیت میں حصہ دار۔ جواب اسی کا ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ تو ہر چیز کی تخلیق پر قادر ہے، چاہے بھی جس طرح ہو۔ سُنتِ عادی و عمومی کے مطابق بھی اور اس کے مخالف بھی۔ اس کی قوت خلاقی کسی صورت وطریق کے ساتھ مقید و محدود نہیں، اور وہ تخلیق کی ہر نوع اور ہر صنف پر قادر، بلا واسطہ ہو یا بہ واسطہ، سب اسکی قدرت کے آگے ہیچ۔ اور وہ سب پر یکساں قادر۔ تو اس بنیاد کو بھلا کیا پیش کرتے ہو ؟

۔۔۔۔ ۴۷ ۔۔۔۔

ایک بڑی معرکہ کی بحث یہ ہے کہ جس طرح ہمارے دیس میں متعدد خاندان ایسے ہیں

جو اپنے کو دیوتا زادے سمجھتے ہیں، اور کوئی چندر بنسی کہلاتے ہیں، یعنی چاند زادے، اور کوئی سورج بنسی، یعنی سورج زادے۔ اسی طرح اہل کتاب انبیا زادوں کا فخر اپنی عالی نسبی حدود سے تجاوز کر کے خدا زادے ہونے تک پہنچ رہا تھا۔ اب قرآن میں اسی مقدمہ کی رُوداد ملاحظہ ہو:

وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (آیت ۲۱)

یہود اور نصرانی کہتے ہیں کہ ہم خدا کی اولاد اور اس کے چہیتے ہیں۔

اور اپنے اس قول سے نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ اس لئے ہم اور انسانوں سے کہیں اشرف و افضل بھی ہیں

نَحْنُ ہم، صیغۂ جمع متکلم سے مراد افراد ملت نہیں، بلکہ قوم یا ملت تھے۔ یعنی من حیث القوم اور نصرانی بہ اعتبار ملت۔

موجودہ بائبل میں ان کے فخریے آج تک لکھے چلے آرہے ہیں:

"خداوند نے یوں فرمایا کہ اسرائیل میرا بیٹا، بلکہ پلوٹھا ہے"۔ (کتاب خروج باب ۴، آیت ۲۲)

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو"۔ (کتاب استثناء، باب ۱۴، آیت ۱)

یہ حوالے توریت کے تھے، اور جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۶، صہ ۹۵ پر انھیں عقائد کی تکرار کی موجود ہے۔ رہی انجیل، تو اس میں بھی اسی طرح کی عبارتیں آج تک لکھی چلی آرہی ہیں:

"جتنوں نے اسے قبول کیا تو اس نے انھیں خدا کا فرزند ہونے کا شرف بخشا"۔ (یوحنا باب ۱، آیت ۱۲)

اَبْنَآءُ (جمع ابن کی) سے مراد حقیقی صلبی بیٹے نہیں۔ اس کے لئے عربی میں دوسرا لفظ ہے۔ وَلَد۔ ابن کا اطلاق مجازی منہ بولے لڑکوں پر پوری طرح ہوتا ہے، اور عربی میں اس کا یہ مجازی استعمال کثرت سے اور بہت عام ہے، امام لغت راغب اصفہانی نے اس کی بہت سی مثالیں اپنے لغت میں جمع کر دی ہیں۔ ابن السبیل، ابن اللیل، ابن العلم، ابن الیوم وغیرہا۔ اور دوسرے اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب اور ابن اور بنت

یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے وہ کسی کی جانب منسوب ہو کر استعمال ہوتے ہیں، اور ایسے ناموں کی ایک پوری فہرست دے دی ہے جو عربی میں بعض اسماء معرفہ و نکرہ کے لئے چلتے ہوئے ہیں۔ مثلاً ابن الطین یعنی حضرت آدم، ابن اللیل یعنی چور، ابن الاقوال یعنی باتونی شخص وغیرہ۔

ہمارے مفسرین نے (اللہ ان پر رحمت کرے) بلا اس کے کہ بائبل کے محاوروں کا کوئی خصوصی مطالعہ کیا ہو، محض اپنے اشراق ایمانی سے یہی معنی قرار دیے ہیں۔ تفسیر کبیر و مدارک وغیرہ میں انھیں نقل بھی کیا ہے کہ ہم خاصان خدا ہیں، خاصان خدا کی اولاد ہیں، اس لئے خود بھی خاصانِ خدا ہی میں شامل ہیں، اور ہمارا اور عام خلقت کا مقابلہ ہی کیا۔ حاصل انکی تقریروں کا یہی تھا کہ ہم خاصانِ خدا اور مقربین حق میں ہیں۔ وہی ذہنیت جو آج مسلمانوں میں بھی کتنے پیرزادوں، بزرگ زادوں، مخدوم زادوں کی ہے۔ قرآن اس عقیدہ پر زد لگاتا ہے:

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُم بِذُنُوبِكُم ۖ بَلْ أَنتُم بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ (مائدہ، ع، آیت ۲۲)

آپ کہہ دیجئے کہ پھر خدا انھیں گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے۔ نہیں، بلکہ تم (محض بشر ہو، اس کی مخلوقات میں سے۔ وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔

یعنی بلا کسی استثنار و امتیاز کے۔ اس کا قانون جزا و سزا تو عام ہے، اور وہی تمہارے لئے بھی ہے

اور وہی حاکم برحق اور قادر مطلق یہ وعدہ کر چکا ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے مغفرت ہے اور اہلِ کفر کے لئے دائمی عذاب۔ بداعمالی پر سزا تو ایک مشاہداتی حقیقت ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہ تھی۔ اور دنیوی سزاؤں کے تذکرہ سے تو عہد عتیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ انھیں کی طرف یہود اور نصرانیوں کو توجہ دلائی ہے کہ قانونِ مجازات و مکافات بھلا

کسی کی رُو رعایت کرتا ہے۔ عذاب سے بچنے پر تمہارا اپنی بزرگ زادگی پر تکیہ رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟

۴۸

بنی اسرائیل کی تاریخ اور یہود کے اعمال و عقائد کا بیان قرآن مجید کے خصوصی موضوعوں میں سے ہے اور بار بار آیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں ایک جگہ ذرا نئے انداز میں ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (آیت ۲۰)

اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! اللہ کا وہ احسان تم اپنے اوپر یاد کرو، جب اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے اور تمہیں خود مختار بنایا، اور تمہیں وہ دیا جو کسی قوم کو بھی نہیں دیا گیا تھا۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اللہ کے دُہرے احسان یاد دلا رہے ہیں۔ ایک یہ کہ پیمبر انھیں کی قوم کے درمیان اُٹھتے رہے۔ فِیْكُمْ یہاں مِنْكُمْ کے معنی میں ہے یعنی تمہاری قوم کے درمیان نعمتِ نبوت رکھ دی، اور نبوت چونکہ ایک مرتبۂ شخصی و انفرادی ہوتا ہے اس لئے قرآنی بلاغت نے یہاں قید "تمہارے درمیان" کی لگادی۔ اور دوسری نعمت بادشاہت ملوکیت یا ملکیت کی ہے۔ چونکہ یہ قومی و اجتماعی ہے، اس لئے بلا کسی قید یا تخصیص کے اسے بلا کسی مِنْكُمْ یا فِیْكُمْ کے، یہاں محض جَعَلَكُمْ کہہ دیا۔

اس نکتہ پر نظر، قرآن کے ہر طالب علم کی، خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں، اور وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ضرور پڑنا چاہیئے، اور عبارت کی اس دقیقہ رسی کی پوری قدر کرنا چاہیئے۔

مُلُوْكًا کا ترجمہ اس میں آپ کو خود مختار سُنایا جا رہا ہے۔ عربی میں مَلِكٌ کا مفہوم

بڑا وسیع ہے، محض بادشاہ یا تاجدار تک محدود نہیں۔ ہر آزاد، خود مختار، صاحبِ حیثیت شخص پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لغت و تفسیر دونوں میں اسے صاف کر دیا گیا ہے۔ اور حدیث میں ایسے شخص پر مَلِك کا اطلاق آیا ہے، جو اپنا ذاتی مکان اور خادم رکھتا ہو، تفسیر ابن جریر طبری میں ہے:

عن زید بن اسلم قال رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم من کان له بیت وخادم فهو مَلِكٌ۔

اور تفسیر قرطبی میں اسی کے مثل روایت نقل ہوئی ہے اور خود قرآن مجید کی سورۃ البقرہ رکوع ۳۰ میں مَلِك سردار فوج کے معنی میں آیا ہے، ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ۔ بلکہ جیوش انسائیکلو پیڈیا، جلد ۷، صفحہ ۵۰۰ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل فلسطین کے محاورہ میں تقریباً ہر سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا۔

حضرت موسیٰ کی یہ تقریر ہے اس زمانہ کی، جب بنی اسرائیل مصر کی غلامی سے آزاد ہو کر جزیرہ نمائے سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ایک ہی وقت میں دینی راہبر و پیمبر بھی تھے اور دُنیوی لیڈر اور سردار بھی۔ ان سے مطالبہ کر رہے تھے کہ اپنے وطن فلسطین چلو اور ظالم و غاصب قوم عمالقہ کو نکال کر وہاں حکومت کرو۔

تازہ تاریخی، اثریاتی، معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ مصر سے ہجرت بنی اسرائیل کا زمانہ ۱۴۴۰ق۔م کا ہے اور فلسطین پر بنی اسرائیل کی فوج کشی کا زمانہ ۱۴۰۰ق۔م کا۔ اس حساب سے حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے، بلکہ عجب نہیں کہ آپ کی عمر کے بالکل آخر حصّہ کا زمانہ ہو۔ توریت کے صحیفہ استثنار کے باب اول سے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسی صحیفہ استثنار ہی میں تصریح بھی موجود ہے کہ آپ نے یہ تقریر دریائے یردن کے کنارے اپنے واقعۂ خروج مصر کے چالیسویں سال کے گیارہویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو ارشاد کی تھی۔

اور یہ شبہ نہ گزرے کہ اسرائیل کو بادشاہت اس وقت تک کہاں ملی تھی فتح کنعان (فلسطین) ہی اس کے بعد ہوئی۔ اور داؤدؑ و سلیمانؑ کی بادشاہتوں کا زمانہ تو اس کے صدیوں بعد کا ہے۔ لفظ ملوک کی تصریح ابھی چند منٹ قبل آپ کے سامنے گزر چکی، اور بالفرض اگر کسی کو ملوک کے معنی بادشاہ لینے پر اصرار ہی ہو، وہ یہ سن لے کہ قرآن اپنے زور بیان میں، جو واقعات مستقبل میں پیش آنے قطعی و یقینی ہوتے ہیں انھیں برابر صیغۂ ماضی میں بیان کر جاتا ہے۔ بادشاہت بنی اسرائیل کی یقینی تھی۔ اور اس کے یقینی ہی ہونے کی بنا پر اسے بجائے مستقبل کے صیغۂ ماضی سے ادا کر دیا گیا۔

تقریر کی بیان کی ہوئی دو نعمتوں، نبوت و ملوکیت کی تشریح ہو چکی۔ تیسری نعمت ابھی باقی ہے۔

وَاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: تمھیں وہ چیز عطا کی ہے جو دنیا بھر والوں میں سے کسی کو نہیں دی گئی تھی، یعنی دولتِ توحید، مذہبی حیثیت سے۔ انھیں خطبات میں دو ایک مقام پر یہ پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ دولتِ توحید من حیث القوم اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے۔ دوسری قومیں اور نسلیں شرک میں پڑی رہا کی ہیں۔ اور قوم اسرائیل شروع ہی سے اس شرف و فضل سے مشرف رہی ہے۔ ہمارے مفسرین کو (اللہ ان پر رحمت فرمائے) ایک عجیب دشواری اس مضمون کی آیتوں میں ہمیشہ پیش آتی رہی کہ اگر سب سے اشرف و افضل نسل اسرائیل کو مان لیا جائے تو پھر اُمت محمدی کے لئے کون سا مقام باقی رہ جائے گا۔ اشکال اور دشواری کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ مقابلہ تو یہاں دنیا کی قوموں اور نسلوں کا ہو رہا ہے اور ان میں سب سے اشرف و افضل نسل اسرائیل ہی ہے۔ یعنی بجائے مشرکانہ خرافات، وہم پرستوں کے عقیدہ توحید اور اس کے لوازم، رسالت، وحی، ملائکہ، حشر و نشر وغیرہ کی حامل یہی ایک قوم رہی ہے۔ لیکن اُمت محمدی نام کسی نسل یا قوم کا کب ہے؟ اس کی بنیاد تو بجائے نسل و نسب کے صرف عقائد صحیحہ پر ہے، اور

اسرائیلی ہو کہ اسماعیلی، عرب ہو کہ عجم، حبشی ہو کہ چینی، گورا ہو کہ کالا ہو، مغربی ہو کہ مشرقی، جو کوئی بھی توحید و رسالت کا کلمہ پڑھنے لگے، بس وہی اُمتِ محمدیہ میں داخل و شامل ہے خاتم النبیینؐ کی نبوت جس طرح سلسلۂ انبیاء کی خاتم ہوئی ہے، قومی و نسلی برتری کی بھی تو قاطع ہے۔

(۴۹)

قرآن فہمی میں ایک بڑا مانع، ہم اُردو دانوں کے لئے، یہ آ پڑا ہے کہ جو الفاظ عربی اور اُردو میں مشترک ہیں، انھیں قرآن میں بھی، اُن کے اُردو ہی مفہوم میں سمجھ لیا گیا ہے کہیں کہیں تو بیشک اشتراک لفظی کے ساتھ معنوی بھی ہے لیکن کثرت سے یہ ہے کہ لفظ اصلاً آیا تو اُردو میں عربی ہی سے، لیکن اپنا مفہوم پورے کا پورا اپنے ساتھ نہ لایا، کہیں کچھ تھوڑا سا مفہوم لے کر آیا، اور باقی وہیں چھوڑ آیا۔ اور کہیں ایسا ہوا کہ یہاں آکر پھیل گیا، اور وہ مطالب اپنے اندر پیدا کر لئے جو عربی داں کے خیال میں بھی نہ آئے۔ اور کہیں تنگی اور وسعت دونوں سے الگ ایک نیا ہی مفہوم پیدا ہو گیا۔ لفظ "وسیلہ" اور لفظ "جہاد" بھی ایسے ہی ہیں، جن کا اُردو مفہوم ان کے عربی مفہوم سے بالکل جداگانہ ہے اور اس کی مثال سورۃ المائدہ ہی کی اس آیت میں مل جاتی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آیت ۴۰)

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، اور اس کا قرب حاصل کرو اور اس کی راہ میں جد و جہد کرو، تاکہ تم ہر طرح فلاح پاؤ۔

عربی میں وسیلہ کے معنی قرب یا نزدیکی کے ہیں۔ ابن جریر طبری، قرطبی، ابن قتیبہ سب نے یہی معنی لئے ہیں۔ یہی معنی متعدد تابعین، مجاہد، حسن، قتادہ، عطاء وغیرہ سے نقل ہوئے ہیں، اور قرب حق کا بہترین وسیلہ احکام الٰہی کی تعمیل ہے۔ ابن عباس صحابی نے کہا ہے:

اطلبوا الیہ القرب فی الدرجات عند اللہ۔

اور تفسیر کبیر میں ہے:

فالمراد طلب الوسیلۃ الیہ فی تحصیل مرضاتہ وذلک بالعبادات والطاعات۔

اور وسیلہ سے مراد مرضیات الٰہی کی طلب و تحصیل ہے۔ عبادتوں اور طاعتوں کے ذریعے سے۔

ہمارے ہاں جن لوگوں نے وسیلہ کے تحت میں بزرگوں سے استعانت اور اولیاء اور انبیاء سے استغاثہ جائز رکھا ہے، انھوں نے عربی کے وسیلہ بمعنی قرب کو، اردو کے وسیلہ بمعنی ذریعہ کا مرادف سمجھ لیا ہے۔ اور ایسی شدید و فاحش غلطیوں کی مثالیں شاذ نہیں، کثیر الوقوع ہیں۔ علامہ آلوسی بغدادی، صاحب روح المعانی نے تفصیل سے اس موضوع پر کلام کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"میت یا غائب شخص سے دعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی بھی عالم کو شک نہیں، اور یہ ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف میں سے کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔ حضرات صحابہ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہوا ہے۔ لیکن کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ اس نے صاحب قبر سے کچھ طلب کیا ہو"۔

آخر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"حضرت عبداللہ ابن عمر کا، اتباع سنت تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کی حالت یہ تھی کہ جب روضۂ نبویؐ پر حاضری دیتے تو صرف اس قدر کہتے کہ السلام علیکم یا رسول اللہ، السلام علیک یا ابابکر، السلام علیک اور اس سے زائد کچھ نہ کہتے، نہ کچھ مانگتے۔ نہ سرورِ عالم سے اور نہ ان کے مکرم مقربین سے"۔

اور وسیلہ کی طرح عربی لفظِ جہاد کو بھی لوگوں نے اُردو کے جہاد کے معنی میں لے رکھا ہے۔ اردو میں جہاد ایک دینی اصطلاح کی حیثیت سے قتال فی سبیل اللہ کے معنی رکھتا ہے، اور اسی کے لئے مخصوص و محدود ہو چکا ہے۔ عربی میں یہ حصر و قید کچھ بھی نہیں۔ عربی میں جہاد کا مفہوم بہت وسیع و عام ہے۔ ہر سخت کوشش جو کسی بھی دینی غرض سے کی جائے۔ خصوصاً دشمنانِ دین کے مقابلہ میں جہاد ہی کا درجہ رکھتی ہے۔ اور جہاد جس طرح میدان رزم میں تیر و تفنگ سے ہو سکتا ہے، اسی طرح بزم میں مال و دولت سے اور زبان و قلم سے بھی ہو سکتا ہے۔

اور انھیں دو اعمال، ایک طلب قرب، اور دوسرے جہاد، پر ترتب فلاح کا ہو جاتا ہے۔ اور اخیر میں خوش خبری ہے کہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، تاکہ تم فلاح یاب ہو جاؤ۔ اور فلاح کے تحت میں دنیا و آخرت کی ہر کامیابی اور ہر کامرانی آگئی۔

(۵۰)

تبلیغ کی دین میں جو اہمیت ہے، وہ ظاہر ہے۔ چنانچہ قرآن میں بار بار اس کی تاکید آئی ہے۔ ایک مقام اسی طرح کا، اسی سورۃ المائدہ میں ہے۔ اور بہت معنی خیز ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آیت ۲۷)

اے ہمارے پیمبر پہنچا دیجئے جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اُترا ہے، اور اگر یہ آپ نے نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیام پہنچایا ہی نہیں۔ اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ یقیناً اللہ کافروں کو راہ نہ دے گا۔

پہلے اندازِ خطاب دیکھیے، يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ تبلیغ کے موقع پر اور اس کے سیاق میں نہ خطاب

خود ہی کتنا بلیغ و حکیمانہ ہے۔ گو اسے مخاطب تمہاری تو حیثیت ہی تمامتر رسول کی ہے پیام پہنچانے والے کی ہے۔ مَآ اُنزِلَ اِلَیْکَ مِن رَّبِّکَ میں قرآن مجید کا سارے کا سارا ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ باقی جو چیزیں وحی خفی کے راستہ سے رسول اللہ کو تعلیم ہوئی تھیں وہ بھی اس عموم کے اندر شامل ہیں۔ ابن عباس صحابی سے یہی معنی منقول ہیں، اور فقہائے مفسرین میں سے قرطبی، عیاض اور نسفی اسی طرف گئے ہیں۔ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے کوئی بات بھی اگر چھپائی تو رسالت کا حق ہی نہیں ادا کیا ــــــ اس میں رد آگیا ان اہل باطل کا، جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نعوذ باللہ، رسولؐ نے اُمت کو قرآن پورے کا پورا نہیں پہنچایا، بلکہ کسی خوف یا کسی مصلحت سے اُسے کسی قدر ناقص صورت میں پہنچایا ہے۔ درحقیقت یہ ہے بھی مرتبۂ رسالت سے بہت ہی گری ہوئی بات کہ پیمبر جیسا عبد کامل، کوئی حکم شریعت کسی کی مروت یا کسی کے دباؤ سے چھپا جائے، اور عائشہ صدیقہؓ نے کیسی لطیف اور سچی بات اس موقع پر کہی ہے کہ اگر آپؐ نے کوئی بھی جزء قرآن کا چھپایا ہوتا تو وہ یہی ہوتا۔ اور اگر یہ کہئے کہ قرآن نے اس درجہ مستبعد مفروضہ کو آپ کی جانب منسوب ہی کیسے کیا؟ تو قرآن نے تو محالات عادی بلکہ محالات عقلی تک کا ذکر و بیان قرآن ہی میں کر دیا ہے۔ مثلاً تاکید توحید کے سلسلہ میں ایک کے بجائے دو خداؤں کا فرض کرنا، اور اس حکم کو اور مؤکد بنانے کے لئے تیقّن کے لہجہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا، آپ تشویش و فکر نہ کریں، یہ آپ کو ہرگز ہلاک کرنے پر قدرت نہ پاسکیں گے ــــــ اور یہاں یہ سوال نہ کیجئے کہ جب محفوظیت کا وعدہ ہو چکا تھا تو پھر جنگ اُحد میں جسم مبارک کو جراحتیں کیسے پہونچیں۔ مفسروں نے یہ سوال پیدا کر کے جواب اپنے اپنے رنگ کا دیا ہے۔ لیکن سب سے صاف اور بے تکلف جواب مفسر تھانویؒ کے قلم سے نکلا ہوا یہ ہے کہ وعدہ محفوظیت تو سیاق تبلیغ میں کیا گیا ہے، اس لئے اس کا تعلق بھی قدرۃً بس اتنی ہی محفوظیت سے ہے، جو آپ کے فرائض تبلیغ میں مانع نہ ہو۔ بالکلیہ محفوظیت

نہ مقصود تھی، نہ ہو سکتی تھی۔ مرض، زخم، صدمہ و غم وغیرہ تو حکمت تکوینی کے ماتحت رفع درجات اور بلندیٔ مراتب کے لئے ضروری ہیں۔ یقیناً اللہ اس کا موقع نہ دے گا کہ آپ کے دشمن آپ تک پہونچ کر تبلیغ دین میں کوئی رکاوٹ پیدا کر سکیں۔ اور فقہا نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ رسول ہی کی طرح نائبان رسول، یا حکمائے امت کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلۂ شریعت میں اخفاء و کتمان سے کام لیں۔

ــــ نمبر (۵۱) ــــ

آج کی صحبت میں، اور کچھ ہی دیر پہلے، آپ سن چکے ہیں کہ جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح ہی تو خدا ہیں، قرآن اُن کی تکفیر قطعی ظاہر کر چکا، اور انھیں دائرۂ شفاعت و سفارش سے باہر رکھ چکا ہے۔ اب ایک دوسرے عقیدہ کو بھی سُن چلئے، جو پہلے عقیدہ کی طرح ایک محدود فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ دنیائے مسیحیت میں خوب رچا بسا ہوا، اور قرآنی تصریحات سے الگ، اور کہیں پست و فروتر ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ م (آیت ۷۳)

یقیناً وہ (لوگ بھی) کافر ہو گئے، جنھوں نے کہا خدا تین میں سے ایک ہے۔

یہ کھلا ہوا اشارہ عقیدۂ تثلیث کی جانب ہے، یعنی اس عقیدہ کی طرف کہ باپ، بیٹا، روح القدس، یہ تینوں اقنوم (اصل) خدا ہیں، منفرداً بھی اور مجموعاً بھی، الگ الگ خدا ہیں، اور تینوں مل کر بھی خدا۔

اور اس وقت دنیائے مسیحیت کا عام عقیدہ یہی ہے۔ قرآن نے اس عقیدہ پر صاف کفر کا اطلاق کیا ہے، اور اس کے ماننے والوں کو کافر کے لقب سے یاد کیا ہے، اور نصاریٰ واہلِ کتاب سے انھیں الگ کر دیا۔ یہ سب بڑے کھرے کافر ہیں، ایمان کے دائرہ سے خارج، اور ساتھ ہی حقیقت حال بھی بیان کر دی۔

وَمَا مِنْ اِلٰہٍ اِلَّا اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ یَنْتَھُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (آیت ۷۳)

اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی معبود نہیں، بجز خدائے واحد کے، اور یہ لوگ اگر اپنے ان اقوال سے باز نہ آئے تو ان میں جو لوگ کافر رہیں گے ان پر عذاب دردناک واقع ہو کر رہے گا۔

کوئی خدا بجز ایک کے نہیں، نہ عدد و شمار کے لحاظ سے، نہ کسی اور اعتبار سے۔ مِنْ اِلٰہٍ میں مِنْ زائد، کلیت یا استغراق کے لئے ہے۔

عذاب واقع ہو کر رہے گا، آخرت میں تو بالیقین، اور دنیا میں بھی حسب مصلحت تکوینی وعید ان کے حق میں ہے، جن پر اس عقیدہ کی گمراہی پوری طرح واضح ہو کر رہی، اور پھر بھی اسی پر قائم ہے مِنْھُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ اس نے یہ صاف کر دیا کہ علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ دنیا میں بہت سے لوگ اپنے اس کافرانہ عقیدہ سے باز آجائیں گے اور ایمان صحیح لے آئیں گے۔ وہ لوگ اس وعید سے خارج ہیں۔ حقیقت مثبت کا بیان ایک ہی آیت بعد پھر ہے:

مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ ؕ کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَھُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ۝ (آیت ۷۵)

مسیح ابن مریم کچھ بھی نہیں، بجز ایک رسول کے، جن سے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اور ان کی ماں ولیہ تھیں۔ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھئے کہ ہم کس طرح صاف دلائل ان کے سامنے بیان کر رہے ہیں۔ پھر دیکھئے وہ کس طرح اُلٹے چلے جاتے ہیں۔

یعنی محض رسول خدا۔ ایک طرف نہ خدا، نہ فرزند خدا، نہ مظہر خدا، نہ مثیل خدا، اور دوسری

طرف نہ ساحر، نہ شعبدہ باز۔ صحیح مرتبہ بس ایک رسول کا، جیسے کہ پہلے بھی رسول آچکے ہیں۔ ابن مریم، لاکر یہ یاد دلایا کہ ایک عورت کے بطن سے تھے، اور اس لئے بجز بشر کے اور کیا ہو سکتے تھے۔ اور ماں صدیقہ تھیں یعنی ولیہ تھیں، نہ مادر خدا، اور نہ معاذ اللہ کوئی مشتبہ چال چلن والی۔ اور دونوں كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ۔ اپنے سارے تقویٰ کے باوجود، اس مادی اور بشری جسم کے ساتھ، ساری مادی وجسمانی ضرورتوں کے محتاج۔ اتنی صاف، سیدھی صریح حقیقت سن کر بھی ان تثلیث پرستوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کے خرافات میں پڑے ہوئے ہیں۔

"اقانیم میں تینوں خدا کی وحدت ایک ہے۔ تین خدا نہیں"۔

"ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے، اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے"۔

"اقنوم وجود باپ ہے، اقنوم جان بیٹا، اور اقنوم علم روح القدس"

یہ صرف نمونے کے طور پر چند مسیحی اسرار دینیات نقل کر دیے گئے۔

اب آج کی صحبت کے اختتام پر وہ آیت ملاحظہ کیجیے جس میں مسیحی شرک کی جڑ بنیاد کی پوری نشان دہی کر دی ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ (آیت ۸۲)

آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، اور ان لوگوں کے خیالات پر مت چلو، جو پہلے (خود بھی) گمراہ ہو چکے ہیں، اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور راہ راست سے بھٹک چکے ہیں۔

اس میں صاف اشارہ اس کا آگیا کہ مسیحیت کی گمراہیاں و بدعقیدگیاں، کسی دوسری گمراہ و بگڑی ہوئی اور زمانہ مسیح سے قبل کی قوم کی ریس اور تقلید نے پیدا کی ہیں۔ اور اَهْوَاء کہتے ہیں لغو وبے بنیاد

خیالات، من گھڑت عقائد اور خیالی ڈھکوسلوں کو۔ جو لوگ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ سے واقف ہیں، اور خود عالم و فاضل فرنگیوں کی مرتب کی ہوئی (Biblical Criticism) پر نظر رکھتے ہیں، وہ ان پتوں کی باتوں پر عش عش کر اٹھیں گے۔

چھٹی صدی عیسوی کا ایک عرب امی، آخر ان تاریخی حقائق سے باخبر ہو ہی کیسے سکتا تھا! تاوقتیکہ عالم الغیب اسے براہ راست تعلیم نہیں دے رہا تھا۔

قدیم مصری شرک، جو یونانیوں میں پوری طرح حلول کر آیا تھا، اور بڑے بڑے یونانی فلسفی، اسکندریہ کے مرکز عقلیت۔ روشن خیالی سے مرعوب و متاثر تھے، حضرت عیسیٰ کی تعلیم جب شروع شروع پھیلی تو اس پر یہود کے اکابر انھیں یونانیوں کے آگے گردن ڈال چکے اور ان سے حلول (LOGOS) وغیرہ کے عقید ے اخذ کر چکے تھے

مسیحیوں نے ان مشرکانہ خرافات کو بلا تامل قبول کرلیا، اور پھر پولوس (سنٹ پال) نے حضرت مسیح کے تعلیمات کو تمام تر مسخ کر کے مسیحیت کو یونانی شرک کی ایک شاخ ہی بنا دیا۔

آخر میں رہی سہی کسر رومیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کردی۔ موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری شرک، یونانی شرک اور رومی شرک کی صدائے بازگشت ہیں، اور بس!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پانچواں خطبہ

(۵۲)

مسیحیت، تثلیث اور مسیح پرستی کا رد سورۂ آل عمران میں اچھا خاصہ ہو چکا ہے لیکن سورۃ المائدہ میں بھی کچھ کم نہیں۔

دو چار آیتیں اس موضوع سے متعلق پچھلے خطبہ میں گزر چکیں۔ اب سورہ کے ختم کے قریب اسی موضوع کی مناسبت سے پہلے کچھ فقرے تذکیر و موعظت کے آئے ہیں، وہ بھی ملاحظہ ہوں۔ ابتدا میں ایک عام تذکرہ حشر میں پیمبروں سے سوال و جواب کا ہے، جو ایک مؤثر مرقع کشی کا کام دیتا ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَآ أُجِبْتُمْ قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝ (آیت ۱۰۹)

(اس دن سے ڈرو) جس دن اللہ پیمبروں کو اکٹھا کرے گا، پھر ان سے پوچھے گا کہ تمھیں کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ ہم کو کچھ علم نہیں چھپی ہوئی باتوں کو خوب جاننے والا تو بس تو ہی ہے۔

انبیاء کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں کہ ہمارے پیچھے ان لوگوں نے کیا کیا کہا! یا یہ کہ ان کے واقعی عقیدے کیا تھے۔ ہم تو ان کے صرف ظاہری اعمال و اقوال کو جانتے ہیں۔ باطن کا

علم تو تجھی کو ہو سکتا ہے۔ اور جزا تو صرف اصل عقائد ہی پر ملے گی۔ اور یہی جواب غلبۂ خشیت سے ادباً و احتراماً بھی ادا ہوگا۔ گویا وہ کہیں گے کہ تیرے علم کامل و محیط کے آگے ہمارا علم ہیچ ہے۔ جو کچھ ہمیں علم ہے بھی اُس کا ہم سے عالم تر تو تو ہی ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ ہمیں جو کچھ علم حاصل ہے وہ محض درجۂ ظن کی چیز ہے۔ اور آج دن کشف حقائق کا ہے، جب محض ظن کام نہیں دے سکتا۔ آج علم ہی کام دے گا، اور وہ تجھی کو حاصل ہے۔

اس عمومی تمہید کے بعد ذکر خصوصی حضرت عیسیٰ کا شروع ہوتا ہے۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلٰى
وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدْتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ قف تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي
الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ
وَالْإِنْجِيلَ ۚ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنْفُخُ
فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۚ
وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِي ۚ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنْكَ
إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هٰذَا
إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (آیت ۱۱۰)

(اور وہ وقت یاد میں رکھو) جب اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے اور اپنی والدہ کے اوپر یاد کرو، جب کہ میں نے تمہاری تائید روح القدس کے واسطہ سے کی تھی۔ تم آدمیوں سے کلام گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی۔ اور جب کہ میں نے تمہیں تعلیم دی کتاب و حکمت کی اور توریت و انجیل کی، اور جب تم پرند جیسی ایک شکل وجود میں لاتے تھے میرے حکم سے، اور پھر تم اس کے اندر پھونک مارتے تھے تو وہ پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے، اور تم مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو چنگا کر دیتے تھے میرے حکم سے، اور جب تم مُردوں کو نکال کھڑا کرتے تھے میرے حکم سے،

اور جب کہ میں نے روک رکھا تھا بنی اسرائیل کو تم سے، جب تم ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر آئے تھے۔ پھر ان میں سے جو کفر اختیار کئے رہے وہ بولے کہ یہ تو کچھ نہیں، بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔

اُذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ نے صاف کر دیا ہے کہ انعامات کا سرچشمہ تو وہی ایک ذات تبارک و تعالیٰ ہے۔ مسیح اس کے صرف ایک نعمت یافتہ و مقرب بندے اور والدہ مسیح اس کی صرف ایک نعمت یافتہ اور معزز بندی ہیں۔

لفظ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ میں یاد دلایا ہے کہ وہ ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے نہ کہ ابن اللہ۔

عَلٰی وَالِدَتِکَ کے طریق تخاطب سے مرشد تھانویؒ نے استنباط یہ کیا ہے کہ اہل اللہ کی اولاد میں ہونا بھی ایک نعمت و شرف ہے۔ رہی آپ کی تعلیم کتاب و حکمت، تو سارے ہی پیغمبر اس لحاظ سے شاگرد حق تعالیٰ ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر ہمارے حضرت خاتم النبیینؐ۔

اور الکتٰب سے سیاق میں مراد جنس کتاب ہے۔

اب رہے وہ خوارق و عجائب، جو آیت کے اس ٹکڑے میں گنائے گئے ہیں، ان سب کی تشریح ایک پچھلے خطبہ میں سورہ آل عمران کی آیتوں کے حوالہ سے اور ان کے ذیل میں عرض کی جا چکی ہے

بِاِذْنِیْ کی تکرار بڑی ہی اہم اور قابل غور ہے۔ خوارق و عجائب، جو کچھ بھی ہوئے بادی النظر میں وہ کیسے ہی عجیب و غریب ہوں۔ بہر حال تھا وہ سب کچھ کسی نہ کسی قانون الٰہی ہی کے ماتحت، قانون تکوینی ہی کی کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت۔ ہر ایک معجزہ میں خالق کائنات ہی کا کوئی نہ کوئی قانون کارفرما تھا۔ معجزہ کی حقیقت جیسا کہ پہلے ہی عرض ہو چکا ہے، بس اتنی ہی ہے کہ وہ خارق عادت ہو جس کا ظہور پیمبر کے ہاتھ پر، منکروں اور کافروں پر پیمبر کی تائید غیبی اور نصرت الٰہی کے اظہار کے لئے کرایا جائے۔ اور خارق عادت وہ واقعہ یا فعل ہے

جو کائنات مادی میں بندوں کے سمجھے اور قرار دیے ہوئے کسی آئین و قاعدے سے الگ ہو۔ مگر فطرت کا عام قانون و قاعدہ تو بندوں ہی کے مشاہدات و تجربات سے اخذ کیا ہوتا ہے مثلاً ہمارے ملک میں جون کے مہینہ میں تیز گرمی اور دسمبر کے مہینہ میں تیز سردی عموماً و عادۃً ہوتی ہے۔ اب کسی پیمبر کی دعا سے جون میں برف پڑنے لگے اور دسمبر میں لُو چلنے لگے تو یہ اس پیمبر کا معجزہ ہوا۔ مادیین یا نیچر پرستوں کی پہلی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے بندوں کے تجربہ و مشاہدہ کو خود خالق کی طرف سے کسی مستقل قانون یا قاعدہ کا اعلان سمجھ لیا۔ اور دوسری غلطی یہ کہ وہ قاعدہ و قانون کو قانون ساز اور قاعدہ گر کی مرضی و ارادہ سے بے نیاز، مستقل و مستمر، لا یزال حقیقتیں قرار دے بیٹھے۔

تَخۡلُقُ یہاں جس سیاق میں آیا ہے، اس کے لحاظ سے تخلق کے معنی صورت بنانے کے ہیں، نیست سے ہست کرنے کے نہیں۔ اور صاحب کشاف نے اسے بھی صاف کر دیا کہ فتنفخ فیھا میں ضمیر ھا ھیئۃ کی طرف نہیں کھیئۃ کے کاف کی جانب ہے۔

اخیر آیت میں یہ جو آیا ہے کہ منکر اور باغی اسرائیلیوں کا حضرت مسیح پر مدت دراز تک بس نہ چل سکا، تو یہ اشارہ اس تاریخی حقیقت کی طرف ہے کہ یہود نے آپ پر غلبہ حاصل کرنے کی بار بار کوشش کی اور بار بار ناکام رہے۔ چنانچہ انجیل یوحنا میں ہے کہ:

"انھوں نے یسوع کو مارنے کا بیڑا اٹھایا تھا، مگر یسوع چھپ کر ہیکل سے نکل گیا۔" (باب ۸، آیت ۵۹)

اور دوسری جگہ اسی انجیل میں ہے:

"انھوں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی، لیکن وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔" (باب ۱۰، آیت ۳۹)

البیّنات کے تحت میں دلائل عقلی اور خوارق و معجزات سب آ گئے۔

(۵۳)

اسی سورۃ المائدہ کے بالکل ختم پر ایک اور بڑا موثر مکالمہ حشر کے دن کا مذکور ہے اور اس میں بھی مسیحیت اور مسیح پرستی کا ایک نئے عنوان و اسلوب سے ہے۔

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ط (آیت ۱۱۶)

(ذہن میں لے آؤ وہ وقت) جب اللہ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم یہ تو بتاؤ کہ کیا تم لوگوں سے یہ کہہ آئے تھے کہ اللہ کے علاوہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لینا۔

آیت میں تو لفظ قَالَ ہے اور ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ یہ صیغہ ماضی کا ہے لیکن یہ بھی قرآنیات کا ہر ادنیٰ طالب علم جانتا ہے کہ قرآن میں ذکر جب کسی مستقبل واقعہ سے متعلق آتا ہے تو اظہار اس سے قطعیت کا کرنا منظور ہوتا ہے یعنی جس چیز کا آئندہ ہونا قطعی اور یقینی ہوتا ہے، اس کو قرآن یوں بیان کرتا ہے جیسے وہ واقع ہو چکی۔ تو قرآن یہاں بھی اپنے اسی عام اسلوب بیان کے مطابق کہتا ہے کہ ذرا اس منظر کو اپنے سامنے لے آؤ کہ جب حق تعالےٰ سوال کرے گا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم یہ تعلیم دے آئے تھے کہ خود تم کو اور تمہاری والدہ کو بھی اللہ کے علاوہ معبود ٹھہرا لیا جائے؟

مسیح پرستی تو خیر موجودہ رائج الوقت مسیحیت کے مرادف ہے ہی، مریم پرستی بھی دنیائے مسیحیت کا کوئی مخفی اور نا معلوم واقعہ نہیں (Divine Virgin) "خدائی باکرہ" ان کا کھلا ہوا لقب ہے، نذریں اور منتیں ان کی مانی جاتی ہیں، نیازیں ان کے نام پر ہوتی ہیں، دعائیں انھیں مخاطب کرکے کی جاتی ہیں، کیتھولک گرجوں میں قد آدم تصویر ان کی لگی رہتی ہے، اور اس کے آگے رسوم پرستش بجا لائے جاتے ہیں۔ کتابی حوالوں کے لئے ملاحظہ فرمائیں اس خاکسار کی

انگریزی تفسیر۔

آخرت میں جو سوال حضرت مسیح سے ہوگا، ظاہر ہے کہ اس سے محض استفہام مراد نہیں، بلکہ مریم پرستوں پر مزید حجت قائم کرنا، اور انہیں شرمندہ و خجل کرنا اور انھیں آپ اپنی نظر میں ذلیل کرنا ہے۔ تخاطب میں لفظ مسیح نہیں بلکہ محض اصلی نام عیسیٰ ہے ابن مریم کے اضافہ کے ساتھ، اور اس حقیقت کے یاد دلانے کو کہ وہ انسان ہی نہیں انسان زادے بھی ہیں!

یہ تو ہوا سوال۔ اب وہ جواب کے پہلے ہی فقرے میں عرض کرتے ہیں:

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۔

عرض کریں گے کہ پاک ہے تیری ذات۔ یہ تو مجھ سے ممکن نہ تھا کہ میں ایسی بات کہہ دیتا جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا۔

یعنی بار الٰہا تیری ذات برتر و بالا ہے۔ ہر شرک کی آلودگی سے اور ہر ایسے انتساب سے جو تیرے شایان شان نہ ہو۔ بھلا میری مجال تھی کہ میں ایسا صریح کلمۂ باطل زبان سے نکال سکتا —— اور آگے عرض کریں گے:

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۔ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۔ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ٥ (آیت ۱۱۶)

اور اگر میں نے (کہیں) کہا ہوتا تو ضرور ہی تجھے اس کا علم ہوتا۔ تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے، اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے۔ بیشک تو تو پوشیدہ چیزوں تک کا خوب جاننے والا ہے۔

بالفرض میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی۔ اور جب تیرے علم میں نہیں تو ظاہر ہے کہ واقع ہی نہیں ہوئی۔ تیرے علم کامل و محیط کو میرے علم ناقص و محدود سے نسبت ہی کیا ہے؟ اور ایک اسی پر کیا موقوف ہے۔ تجھ پر تو ہر غیب روشن ہے۔ آئینہ ہے۔ امام رازیؒ نے خوب فرمایا ہے کہ سوال کا جواب براہ راست دینے کے بجائے

اسے علم الٰہی پر محمول کر دینا ادب واحترام کے تقاضے کے زیادہ مطابق ہے۔ اور بطور تتمیم وتکملہ، یہ خادم عرض کرتا ہے کہ مسیح کا یہ کلام عبدیت وعبودیت کا بھی شاہد عادل ہے۔ آپ یہ نہیں کہتے کہ میں تعلیم فلاں اور فلاں دے آیا تھا، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں تو وہی تعلیم دے آیا تھا جس کا تو نے حکم دیا تھا۔ اور یہ پیام بھی میری اپنی طرف سے نہ تھا، بلکہ یہ بھی تیرے ہی ارشاد کی تعمیل تھی۔

قرآن آپ کے جواب کی مزید حکایت یوں بیان کرتا ہے:

مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ

میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا سوا اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا تھا، وہ یہی کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔

یہ تو ہوئی قرآن مجید کی حکایت۔ لیکن خود انجیلوں میں اتنی تصحیف وتصرف کے بعد بھی یہ تعلیم لکھی چلی آتی ہے۔ چنانچہ انجیل متی میں ہے:

"یسوع نے اس سے کہا "اے شیطان دور ہو، کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔ تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا اور فرشتے آکر اس کی عبادت کرنے لگے (باب ۴۔ آیت ۱۰-۱۱)

اور انجیل لوقا میں ہے:

"یسوع نے جواب میں اس سے کہا کہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (باب ۴، آیت ۸)

جواب مسیح ابھی ختم نہیں ہوا۔ چل رہا ہے:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ (آیت ۱۱۷)

میں ان پر آگاہ رہا، جب تک میں ان کے درمیان رہا۔ پھر جب تو نے مجھے

اُٹھالیا (جب سے) تو ہی ان پر نگراں ہے۔ اور تو تو گواہ ہر چیز پر ہے۔

غور کیجیے کلام میں، ایک بار پھر اپنی عبدیت و بشریت کا اور حق تعالیٰ کے علم محیط و کامل کا اثبات ہے۔ کہتے ہیں کہ میں جب تک دنیا میں موجود رہا، اپنی اُمت کا حال میرے علم و مشاہدہ میں تھا۔ پھر تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا۔ اس کے بعد سے مجھے کیا خبر، خبر اس کا علم تو بس تجھی ہمہ وقتی نگراں کو رہ سکتا ہے۔ اور آگے چلئے:

اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝ (آیت ۱۱۸)

تو اگر انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو انھیں بخش دے تو بھی تو، زبردست ہے، حکمت والا ہے۔

عرض کرتے ہیں کہ تو مالک و مختار ہے، ہمہ داں و ہمہ تواں ہے۔ تو جو چاہے ان کے ساتھ معاملہ کر۔ اگر سزا کا معاملہ کرے تو میں تجھ میں اور تیرے بندوں کے درمیان دخل دینے والا کون، اور اس کی مجھے کہاں مجال۔ اور اگر تو انھیں معاف ہی کر دینا چاہے تو کون تجھے روک سکتا ہے۔ تو سب پر غالب اور تیرا ارادہ سب پر حاکم و مقتدر، اور اسی کے ساتھ تو حکیم مطلق بھی۔ تیرا کوئی بھی فیصلہ حکمت و مصلحت تکوینی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ تو کرے گا وہی جو عین آئینِ حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا۔

یاد کر لیجیے کہ یہ ساری گفتگو دنیا میں نہیں، قیامت میں ہو رہی ہے، جب کوئی محل ہی شفاعت کا کافروں اور منکروں کے حق میں باقی نہ رہے گا۔ یہیں سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے اس کلام میں کوئی شائبہ شفاعت و سفارش کا، باوجود ان کے پیمبر جلیل القدر ہونے کے نہیں۔ بلکہ تفویض یا سپردگی تمام تر اللہ کی طرف ہے۔

اور ضمناً اس سے تردید بھی مسیحیوں کے اس عقیدہ کی نکل آئی کہ قیامت میں عدالت کا کام خدا کے نہیں، خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا۔ انجیل یوحنا میں ہے:

"باپ کسی کی بھی عدالت نہیں کرتا، بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے پر رکھا ہے" (باب ۵، آیت ۱۳)

ان سارے مکالمات و مخاطبات کے بعد قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ۚ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۚ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ (آیت ۱۱۹)

اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے، جب سچوں کے کام ان کا سچ آئے گا، ان کے لئے باغ ہوں گے، جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ اللہ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش رہا اور وہ اللہ سے خوش رہے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

صٰدِقِیْنَ کا لفظ ابھی آپ نے سنا ہے۔ اس کا مفہوم سمجھ لیجیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں عقیدۂ صحیح اور عمل صالح پر قائم رہے۔ اس کے تحت میں انبیاء کے علاوہ اولیاء اور عام مومنین بھی داخل ہیں۔ عام مفسرین ادھر گئے ہیں کہ یہ اشارہ پوری آیت کے مضمون یعنی جنت، اور خلود جنت اور رضوان الٰہی سب کی جانب ہے۔ لیکن امام رازی نے اپنی نکتہ سنجی سے یہ بات پیدا کی ہے کہ الفوز العظیم کا تعلق صرف نعمت رضوان الٰہی سے ہے۔ جس کے سامنے جنت کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ اور ان نعمتوں کو خلود ہی نہیں ابدیت بھی حاصل ہو گی۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا کے ساتھ اَبَدًا کی بشارت یہاں کی طرح اور بھی بار بار اہلِ جنت کے لئے آئی ہے اور اہلِ جہنم کے لئے اَبَدًا کی صراحت ایک ہی جگہ آئی ہے۔

(۵۴)

جاہلی قوموں کی ذہنیت بھی، ان کے عقائد کی طرح، ایک خاص قسم کی ہوتی ہے قرآن مجید نے

کثرت سے مقامات پر ان کے اعتراض نقل کرکے اس کا پردہ بھی فاش کیا ہے۔

وَقَالُوا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ط (انعام، آیت ۸)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان (پیمبر) کے اوپر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔

کہنے والا مشرکین ہی کا کوئی گروہ تھا۔ رسول کا بشر محض ہونا ان کی سمجھ ہی میں نہ آتا۔ ان کی سمجھ میں اوتار یا مظہرِ خدا آجاتے تھے۔ یہ دیوتاؤں کے بلا تامل قائل تھے۔ خدا کے بیٹے بیٹیاں یقین کرسکتے تھے۔ یہ سب بآسانی ان کے لئے قابل قبول تھا۔ لیکن بشر کی رسالت کو ان کے دماغ کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ ہوسکے۔ برابر مطالبہ ان کی طرف سے ماورائے بشریت کا، خرقِ عادت کا ہوتا رہتا۔ فرشتہ کا بھی تخیل ان کے یہاں نہ تھا۔ البتہ پیمبر جب کہتے کہ فرشتہ میرے پاس پیامِ الٰہی لاتا تو اسے فرض کرکے یہ کہتے کہ اچھا، اگر ایسا ہے تو فرشتہ کو لاؤ یعنی دکھاؤ۔ حالانکہ قائل جب بھی نہ ہوتے۔ بلکہ سخن پروری کی عادت سے مجبور ہوکر بانگ ہی کیے چلے جاتے۔

آگے جواب میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ٥ (آیت ۸)

حالانکہ اگر ہم فرشتہ اتار دیتے تو قصہ ہی ختم تھا، پھر تو ان کو ذرا مہلت نہ ملتی۔

یعنی فرشتہ کا نزول دنیا میں اس طرح کہ وہ کافروں تک کو نظر آجائے یہ تو دستورِ الٰہی میں عین وقوعِ عذاب کے وقت ہوتا ہے، اس کے بعد مہلت کا امکان ہی کہاں ہے؟ عام فہم اردو میں یوں سمجھئے کہ ایسے کھلے ہوئے معجزہ کے بعد عالمِ ناسوت کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور غیبت کے پردوں کے بجائے مواجہہ میدانِ شہود کا ہوجاتا ہے۔ عالمِ برزخ اسی کا دوسرا نام ہے، اور وہ عالم کشفِ حقائق کا محل ہے۔

اور کافروں کی اصل حقیقت معذب ہی ہونا ہے۔ اس لئے اس طاری شدہ عالمِ برزخ کے وجود میں آتے ہی اس حقیقت کا ظہور اور سزا و عذاب کا ترتب لازم ہوجاتا ہے۔

ثُمَّ لَا يُنظَرُونَ ٥ آیت میں ثُمَّ اس اظہار اشدیت کے لئے ہے یعنی عذاب واقع تو ہو ہی گا، اس سے بڑھ کر یہ کہ مہلت ذرا بھی نہ ملے گی۔

گویا عذاب کی شدت سے بھی بڑھ کر اس کا فوری وقوع ہے ـــــ مزید یہ کہ:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ٥ (آیت ۹)

اور اگر ہم فرشتہ ہی کو تجویز کرتے تو اسے بھی آدمی ہی بنا کر بھیجتے اور ان پر ہم (پھر) وہی اشتباہ ڈالتے جس میں اب پڑے ہوئے ہیں۔

یعنی یہ لوگ اس انسانی صورت والے فرشتہ کے باب میں وہی احتمالات، وہی اشکالات، وہی کج بحثیاں پیدا کرتے، وہی کٹ حجتیاں نکالتے جو آج رسول اللہ سے متعلق نکال رہے ہیں۔

مَلَكٌ یا فرشتہ وہ نوری ہستی ہے، جسے انسان نہ اپنے عام و معروف حواس سے دیکھ سکتا ہے، نہ اس کے ملکات کے لحاظ سے اس کا اتباع کر سکتا ہے۔

لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا: اسے بھی شکل و جسم کے لحاظ سے انسان ہی کی جنس کا بنا کر بھیجتے تو تم اسے اپنی اِن آنکھوں سے دیکھ تو سکتے۔

لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ، یہ اشتباہ کا انتساب حق تعالیٰ کی بابت محض تکوینی حیثیت سے اور بہ طور مسبب الاسباب کے ہے۔ اس معنی میں اللہ سانپ کے زہر کا بھی خالق ہے، بیماری اور ہر دکھ درد کا بھی خالق ہے۔ بدی کا بھی خالق ہے۔ یہاں تک کہ شیطان کا بھی خالق ہے۔

اور ایمان، اسی کے ساتھ سُن لیجئے، کہ نام ہے قلب کی ایک کیفیتِ اختیاری کا، باقی کسی ایسے معجزہ کا سامنے آجانا، جس سے انسان بالکل بے اختیار و مجبور ہو جائے، جیسا کہ فرشتہ کو اس کی اصل پر دیکھ لینا، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ایمان اختیاری باقی ہی کہاں رہا؟ ایمان تو معتبر جب ہی تک ہے جب تک ایمان بالغیب ہے، جب انکشاف و شہود شروع

ہو گیا تو ایمان کا سوال ہی نہ رہا۔

(۵۵)

یہ سورۂ انعام چل رہی ہے اور اس کا بیشتر حصّہ مسائل و احکام فقہی سے متعلق ہے تاہم دوسری قوموں کے عقائد و اعمال سے بھی جابجا تعرض ہے۔ اہل کتاب کے متعلق ذکر ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ ؕ (آیت ۲۰)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے وہ ان (صاحب) کو پہچانتے ہیں ایسا ہی جیسے اپنے ابنائے قوم کو پہچانتے ہیں۔

اس میں بنائے اشکال لفظ اَبْنَآءَھُمْ ہے۔ مفسرین و مترجمین کثرت سے ادھر گئے ہیں کہ اس سے مراد ان کے بیٹے اور صلبی بیٹے ہیں۔ اور پھر اس اشکال کو حل کرنے کی ضمن میں طرح طرح کی توجیہات و تاویلات کی ہیں۔ حالانکہ اَبْنَآءَھُمْ سے مراد اگر ابنائے قوم لئے جائیں تو سرے سے کوئی اشکال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور مطلب صاف یہ نکلتا ہے کہ نبی آخر الزماں کی جو کھلی علامتیں ان کی کتب آسمانی، خصوصاً توریت میں دی ہوئی ہیں، ان کے لحاظ سے انھیں آپ کا پہچان لینا اور آپ کی تصدیق کرنا ایسا ہی آسان ہے جیسے خود اپنی قوم و نسل کے انبیاء، انبیاء بنی اسرائیل کی شناخت۔ یہاں ذکر اہل کتاب کا مجموعاً و مشترکاً ہو رہا ہے، نہ کہ ان کے افراد کے لحاظ سے۔ سورۂ بقر کی آیت ۱۴۰ میں ایسے ہی لفظ آچکے ہیں، اور کسی پچھلے خطبہ میں بھی وہ آیت آپ کی سماعت میں آچکی ہے۔

(۵۶)

قرآنی قصوں میں ایک اہم و مشہور قصّہ رئیس الموحدین حضرت ابراہیمؑ کے

ایمان توحیدی کا ہے۔ آپ کے والد جن کا نام عربی میں تارح آیا ہے اور انگریزی میں تلفظ تیرہ (Terah) ہے اور فلسطین کا قدیم مسیحی مؤرخ یوسیبیس (Eusebius) کے ہاں آثر یا اشر ملتا ہے۔ قرآن مجید نے ان کا نام آزر بتایا ہے، وہ بُت پرست ہی نہ تھے بلکہ جیوش انسائیکلوپیڈیا کی روایت کے مطابق بُت ساز یا بُت فروش بھی تھے (جلد ۱۲۔ صفحہ ۱۰۷) اور آپ کا ملک کلدانیا یا بابل (موجودہ عراق) بُت پرستی اور ستارہ پرستی کے دُہرے شرک میں مبتلا تھا تو انھیں ابراہیمؑ کی سرگزشت قرآن کی زبان سے سُنئے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آیت ۷۴)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو۔ میں تمھیں اور تمھاری قوم کو کھُلی ہوئی گمراہی میں مبتلا پاتا ہوں۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ (آیت ۷۵)

اور (اس لئے) ہم نے دکھادی ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی حکومت، تاکہ وہ ہوجائیں کامل یقین کرنے والوں میں سے۔

چنانچہ وہ خود مُوحّد کامل بھی ہوگئے، اور توحید کامل کے مبلّغ بھی۔ یعنی زمین اور آسمان پر حق تعالیٰ کی حکومت قاہرہ کے مشاہدہ سے ان کے دل پر توحید کا نقش جم گیا اور ازدیادِ معرفت نے انھیں مزید ایقان تک پہنچا دیا۔

ملکوت سے مراد ہے وہ حکومت جو مخصوص ہے اللہ ہی کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی ربوبیت اور مالکیت کے طریقے ابراہیم کے دل میں اُتار دیے۔ اور مشاہدہ

یا اِدراعت کے لئے یہ لازمی نہیں کہ وہ مادّی ہی آنکھوں سے ہو۔ چشم اعتبار یا بصیرت عقلی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اور ملکوت کی اضافت میں جو زمین کے حدود کے ساتھ سماوات یا آسمان بھی شامل کرلئے گئے، اس کی بلاغت اور زیادہ ہو جائے گی۔ جب یہ یاد کرلیا جائے کہ اہل کلدانیہ زمینی ہی شرک (بت پرستی) کے نہیں بلکہ آسمانی شرک (ستارہ پرستی) کے بھی مجرم تھے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ
فَلَمَّا أَفَلَ قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ ۝ (آیت ۷۶)

اور جب رات ابراہیم پر چھا گئی تو انھوں نے تارہ دیکھا۔ بولے یہی میرا پروردگار ہے۔ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو بولے میں غروب ہوجانے والوں سے دل نہیں لگاتا۔

اور نہ ایسوں کی الوہیت و معبودیت کا قائل ہو سکتا ہوں۔

ہرگز نہ سمجھئے کہ یہ سارا مکالمہ جو چل رہا ہے، ایک ہی وقت میں ہوا۔ چاند اور سورج کا مشاہدہ ایک ساتھ ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ یقیناً کل ماجرے کے مختلف اجزا مختلف اوقات میں ہوئے۔

کَوْکَبًا تو لفظی اعتبار سے کوئی بھی ستارہ ہو سکتا ہے، لیکن لگتی ہوئی بات یہ ہے کہ وہ کوئی بہت ہی روشن ستارہ ہوگا۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ پرستش سب سے زیادہ ان دو ستاروں کی ہوتی ہے: ایک مشتری (Jupiter) دوسرا زہرہ (Venus) ساتھ ہی ہمارے مفسرین قدیم کی صفائے قلب دیکھئے کہ ان کے قلم سے نام ان ہی دو ستاروں کے نکلے ہیں۔

خیر تو آپ نے کوئی روشن ستارہ دیکھا اور اپنی قوم پر حجت الزامی قائم کرنے کو انھیں دکھا کر کہا کہ یہی ہے ہمارا پروردگار یعنی تمھارے زعم و پندار میں۔ یہ طریق مخاطبت اردو،

فارسی، عربی، انگریزی، ہر زبان میں عام ہے کہ مناظرہ کے وقت مخالف کے قول کو اپنی زبان سے دُہرا دیتے ہیں اور لب و لہجہ سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب کا قول اور خیال نقل ہو رہا ہے بغیر اس کے کہ متکلم اس کی تصریح کرے۔ خود قرآن ہی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ فرمائے گا اَیْنَ شُرَکَائِیَ؟ اب کہاں ہیں میرے شریک؟ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ تمھارے عقیدے کے مطابق میرے شریک۔ اور یہ مطلب کوئی احمق سے احمق بھی نہ لے گا کہ حق تعالےٰ اپنے شریکوں کا وجود تسلیم کر کے واقعی انھیں بلا رہا ہے۔

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ سے آپؑ، نفی اُن کی مطلق معبودیت کی نہیں، بلکہ محبوبیت کی بھی کر رہے ہیں۔ آپ فرما رہے ہیں کہ جو ہستیاں خود ہی غیر ثابت اور تغیر پذیر ہوں، ان کے لئے جگہ میرے دل میں کسی عزت و قعت کی کیسے ہو سکتی ہے؟ عدم محبوبیت سیاق عبارت میں صاف عدم معبودیت کے مرادف ہے

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ۝ (آیت)

پھر جب آپ نے دیکھا چاند کو چمکتے ہوئے تو بولے یہ میرا پروردگار ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے کہ اگر مجھے میرا پروردگار نہ ہدایت کرتا رہے تو میں بھی گمراہ لوگوں میں ہو جاؤں۔

لیکن اس کی ہدایت تو اول روز سے میرے شامل حال ہے، اور اس لئے میں توحید پر قائم ہوں ——— انبیاء کا یہ کمال عبدیت ہے کہ اپنے ہنر یا کمال کو اپنی جانب منسوب نہیں کرتے بلکہ اسے تمام تر عطیۂ الٰہی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ اور ستارہ پرستی کی طرح قمر پرستی تو جاہلی قوموں میں عام رہی ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ (آیت ۷۸)

پھر جب آپ نے سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو بولے یہی میرا پروردگار ہے، یہ سب سے بڑا ہے، لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو بولے اے میری قوم والو! میں اس شرک سے بری (بیزار) ہوں جو تم کرتے ہو۔

مِمَّا تُشْرِكُوْنَ میں یہ نہیں فرمایا، کہ جس شرک میں میں اب تک مبتلا تھا اس سے نکل آیا، بلکہ یہ فرمایا کہ وہ شرک جس میں قوم والے مبتلا ہیں۔

هٰذَآ اَكْبَرُ، آفتاب تو اجرام سماوی میں سب سے زیادہ پُجا ہے، اور اہل کلدانیہ اس میں پیش پیش رہے ہیں۔

هٰذَا رَبِّيْ، آپ کی گفتگو میں یہ لفظ تین بار آیا ہے، اور وہ تینوں موقعوں پر آپ نے اپنے ہم قوم مشرکوں کی ترجمانی لفظ رب ہی سے کی ہے، کہیں اللہ وغیرہ نہیں لائے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ شرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفت ربوبیت ہی میں لگی ہے، اور یہی آج تک چلا آرہا ہے۔ سورج دیوتا، چندرمان اور زہرہ و مشتری کو خالق کوئی بھی نہیں کہتا۔ مشرک انھیں مخلوق مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ ہمارے کارساز ہیں، ہماری مرادیں ان ہی سے وابستہ ہیں۔ ہماری دعائیں یہی سنتے ہیں، ہماری آرزوئیں یہی پوری کرتے ہیں۔ رَبّ کا لفظ ایسے موقع پر معنویت سے لبریز ہے۔

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ (آیت ۷۹)

میں نے اپنا رُخ یکسو ہو کر اسی کی طرف کر لیا ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ (آیت)

اور ان کی قوم لگی ان سے جھگڑنے، بولے کیا تم جھگڑا مجھ سے اللہ کے بارے میں کرتے ہو، درانحالیکہ وہ مجھے ہدایت دے چکا ہے۔

حضرتِ خلیل اپنے دعویٰ پر دلیل بھی ساتھ ساتھ لاتے ہیں۔ چنانچہ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کہہ کر یہ فرما رہے ہیں کہ میں تو اس خدائے واحد کا قائل ہوں جو تمہارے خود ساختہ زمینی اور آسمانی خداؤں، دیوتاؤں کا بھی خالق ہے

سارے مکالمہ میں آپ ایسی کوئی بات زبان سے ادا نہیں فرماتے جس سے معلوم ہو کہ آپ پہلے مشرک تھے، اور اب پہلی بار موحّد ہوئے ہیں۔ اور امام رازی نے یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ وَجَّهْتُ کے ساتھ قاعدۂ نحوی کا مقتضا یہ تھا کہ وَجْهِيَ اِلَى الَّذِيْ لایا جاتا، لیکن غیرتِ تنزیہہ کو یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ اِلٰی لا کر کوئی شائبہ یا سمت یا جہت یا مادی مرکزیت کا پیدا کیا جائے! اس لئے بجائے اِلٰی کے صرف لِ لے آیا گیا۔

اور یہ جو آپ نے اپنی قوم والوں سے مخاطبہ میں فرمایا کہ اَتُحَاجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ تو اس مقولہ کو سادہ طور پر نہیں بلکہ ذرا حیرت و استعجاب کے لہجہ میں ادا کیجیے، جب پورا مطلب واضح ہوگا یعنی اللہ کی شان! تم مجھ سے بحث و جدال کرنے چلے ہو توحید کے مسئلہ میں جو مجھ پر بالکل کھل چکا ہے۔ اور مجھے ہدایت علم الیقین کیا، عین الیقین کے درجہ پر مل چکی ہے۔ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ کی صراحت سے کھل گیا کہ قوم والے بجائے اس کے کہ حضرت کی صاف سیدھی، فطری تعلیم کو مان لیتے، اُلٹے بحث و جدال میں ڈٹ گئے، اور لگے ان سے اُلٹی سیدھی کج بحثیاں کرنے۔ جیسا کہ ہر جاہلی مشرک قوم کا شیوہ ہے۔

(۵۷)

ہمارے رسول اور رسولِ اعظمؐ کی آمد کے تذکرے پرانے صحیفوں اور آسمانی نوشتوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ قرآن نے اہلِ کتاب کو مخاطب کر کے ان کی نشان دہی بھی بار بار کر کے ان پر حجت قائم کی ہے۔ سورۂ اعراف میں بھی یہ تذکرے ہیں۔ اور ایک جگہ تو بڑی وضاحت و تفصیل سے ارشاد ہوا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ٘ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۵ (آیت ۱۵۷)

جو لوگ پیروی کرتے ہیں اس رسول و نبی کی جسے ان لوگوں نے لکھا ہوا پایا توریت اور انجیل میں، وہ انھیں نیک کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں بُرے کاموں سے روکتا ہے، اور ان کے لئے پاکیزہ چیزیں بتاتا ہے، اور ان پر گندی چیزیں حرام رکھتا ہے، اور ان پر سے بوجھ اور قیدیں جو اُن پر اب تک تھیں، اُتارے دیتا ہے۔ سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کا ساتھ دیا اور ان کی مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اُتارا گیا۔ سو یہی لوگ تو ہیں پوری فلاح پانے والے

یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا : جسے لکھا ہوا پاتے ہیں"، کے کھلے ہوئے معنی ہیں جس کی صفات و علامات وہ لکھی ہیں پاتے ہیں اپنے صحیفوں میں۔

الّذِیْن سے مراد عام انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہاں مراد خصوصی ہے اہل کتاب سے۔ اور رسول اُمّی سے مراد بے پڑھا بھی ہو سکتا ہے (جیسا کہ آپ واقعۃً تھے) اور ام القریٰ والا بھی، اور اُمت رکھنے والا بھی۔

اور حاصل ان سب نسبتوں کا ایک ہی ہے یعنی شخصیت محمدی۔ تو آپ کی بابت علامتیں توریت و انجیل سے تحریف و تصحیف کے بعد بھی نہ دھل سکیں۔ توریت کے دو ایک حوالے آپ بھی سُن لیں۔ صحیفۂ استثناء باب ۱۸ کی پندرھویں آیت ہے:-

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا،

تم اس کی طرف کان دھریو۔"

"تیری مانند" کا اطلاق اگر ہمارے رسول پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا؟ اور پھر تیرے بھائیوں میں سے بنی اسمٰعیل اگر بنی اسرائیل کے بھائی نہ تھے تو اور کون تھے۔

دوسری آیت بھی اسی صحیفۂ استثنا کے اٹھارویں باب کی اٹھارویں آیت ہے

"اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کیا سو اچھا کیا، میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام ان کے منھ میں ڈالوں گا۔"

پھر وہی بھائیوں کا ذکر، اور اسرائیل کے بھائیوں، اسماعیلیوں میں سے، اور وہ بھی وحی لفظی کا دعویٰ لے کر، اور کوئی دوسرا نبی آیا ہے؟

تیسری جگہ پھر اسی صحیفہ کے باب ۳۳ کی دوسری آیت ہے:

"خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران کے میدان میں وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اور اس کے داہنے ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔"

سینا سے اشارہ حضرت موسیٰ کی، اور سعیر سے اشارہ حضرت عیسیٰ کی جانب ہونا جس طرح ظاہر ہے، اسی طرح مکہ کی پہاڑی فاران سے اشارہ حضرت محمدؐ کی جانب ہونا بالکل ظاہر ہے۔ آتشیں شریعت اسی رسول کی تھی۔ دس ہزار پاک نفس صحابہ کے ساتھ فتح مکہ کے وقت شہر میں داخلہ بھی ہمارے ہی رسول کا ہوا تھا۔

چوتھا حوالہ صحیفۂ پیدائش کے باب ۱۷ کی اکیسویں[۲۱] آیت کا ہے:

"اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا، اسے برومند کروں گا، اور اسے بہت بڑھاؤں گا، اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے، اور میں اسے ایک بڑی قوم بناؤں گا۔"

حضرت اسمٰعیل کی نسل کے حق میں یہ سارے وعدے ہمارے رسول ہی کی ذات میں پورے ہوتے ہیں۔

صحیفۂ پیدائش کا ایک اور حوالہ اس کے باب ۴۹ کی دسویں آیت کا:

"یہوداہ سے ریاست کا عصا جدا نہ ہوگا، اور نہ حاکم اس کے پاؤں کے درمیان سے جاتا رہے گا جب تک کہ شیلا اس کے پاس نہ آجائے، اور قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی"۔

دنیا کی مختلف قومیں ہمارے رسول ہی کے علَم کے نیچے جمع ہوئیں، اور شیلا کے معنی ہیں بھیجا جانے والا ہے۔ بھیجے جانے والے وہی نبی تھے اور انھیں کے بعد سے یہود کا اقتدار نمایاں طور پر ختم رہا۔

اسی طرح حضرت داؤد کے ایک نغمہ میں ہے:

"میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا۔ بس سارے لوگ ابدالآباد تیری ستائش کریں گے"۔ (زبور ۴۵ - ۱۷)

ایک اور حوالہ بھی اسی عہد عتیق کے صحیفۂ یسعیاہ کا ہے:

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا، میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے، میں نے روح اس پر رکھی۔ وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا۔ وہ عدالت جاری کرائے گا کہ دائم رہے اور اس کا زوال نہ ہوگا، اور نہ وہ جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا، اور بحری ممالک اس کی راہ تکیں (باب ۴۲، آیت ۱-۴)

"میرا بندہ" اس عبارت میں صاف عَبْدُہٗ و رَسُوْلُہٗ ہے، اور "میرا برگزیدہ" صاف "مصطفیٰ" ہے، اور جس کا "زوال نہ ہوگا" وہی تو "خاتم النبیین" ہے اور انھیں کی شریعت بحری ممالک تک پھیل گئی۔

یہ سارے بیانات عہد عتیق کے تھے۔ اب انجیل کی بھی سنیے:

متی کے باب ۲۱ کی آیات ۴۲ تا ۴۴ یہ ہیں:۔

"یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لئے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر جس پر وہ گرے گا اسے وہ پیس ڈالے گا"۔

جس پتھر کو اسرائیلیوں نے ہمیشہ رد کیا تھا، وہ اسمٰعیلی تھے۔ اور آخر میں اسی اسمٰعیلی نسل کے فرد کو نبوت ملی اور نبوت بھی اس شان کی کہ یہود و نصاریٰ جو بھی اس سے ٹکرائے چور چور ہو کر رہ گئے۔

انجیل لوقا میں حضرت مسیح کا بیان ہے کہ:

"وہ وعدہ کہ جس کا میرے باپ نے وعدہ کیا ہے، اس کو تم پر نازل کروں گا لیکن جب تک عالم بالا پر سے تم کو قوت کا لباس نہ ملے، اس شہر میں ٹھہرے رہو (باب ۲۴ آیت ۴۹)

جب تک ہمارے رسول کا نزول اجلال نہ ہو لیا، تقدس شہر یروشلم ہی کا قائم رہا۔ اور اس کے بعد کعبہ (واقع شہر مکہ) کی طرف منتقل ہوا۔

اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب حضرت یحییٰ کے ظہور کے بعد یروشلم سے کاہن اور آئے ان کے پاس یہ پوچھنے کے لئے کہ تو کون ہے تو سوال و جواب کے بعد ان لوگوں نے کہا کہ:

"اگر تو نہ مسیح ہے، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے"۔ (باب اول۔ آیت ۲۶)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہود مسیح کے علاوہ کسی اور نبی کے بھی منتظر تھے جسے وہ اپنی زبان میں "وہ نبی" کہتے تھے، یعنی قرآن کی زبان میں "النبی"۔

اور اسی انجیل یوحنا کے باب ۷ کی چالیسویں آیت ہے کہ:

"پس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا کہ بے شک یہی وہ نبی ہے۔ اوروں نے کہا یہ مسیح ہے"۔

یہ مزید ثبوت اس کا ہے کہ علاوہ مسیح کے ایک اور نبی موعود (النبی) کے آنے کا برابر انتظار ہو رہا تھا۔

اور اسی انجیل یوحنا کے باب ۱۴ کی سولھویں آیت میں خود حضرت مسیحؑ کی زبان سے نقل ہوا ہے:-

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ دوسرا مددگار (یا شفیع یا وکیل) بھیجے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے"۔

تو یہ ابد تک رہنے والا بجز خاتم النبیین کے اور کون ہو سکتا ہے؟

انجیل یوحنا کے حوالے ابھی ختم نہیں ہوئے۔ اس کے باب ۱۵ کی چھبیسویں آیت ۲۶ میں حضرت مسیح کی زبان سے ہے:

"جب وہ مددگار (یا شفیع یا وکیل) آجائے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح، جو باپ کی طرف سے نکلتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا"۔

اور یہ ابد تک ساتھ رہنے والا اور حضرت مسیح کی تصدیق کرنے والا بجز ہمارے رسول اکرمؐ کے اور کون ہو سکتا ہے؟

اور یہ سارے انجیلی حوالے جو عرض ہوئے سب انھیں انجیلوں کے ہیں جو مسیحی کلیسا کو مسلّم اور ان کے ہاں مستند ہیں۔ باقی مسیح کے حواری برنابا کی انجیل، جس کا ترجمہ عربی اور انگریزی دونوں میں اسی بیسویں صدی میں ہوا ہے، اسی میں کہیں زیادہ اور اشارہ کنایہ میں نہیں بلکہ صریح و واضح الفاظ میں ہمارے نبی کی آمد کی شہادت دے رہی ہے۔

اب قرآن کی آیت میں بوجھ اُتار دینے کی جو بات ہے تو وہ دوسرے لفظوں میں یہی ہے کہ اس رسول کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ اور ان پر حاکم ہوگی۔ اور وہ پیمبر انھیں نیکی کا حکم دے گا، اور بدی و خباثت کی ہر راہ روکے گا۔ اس کی شریعت جامع و کامل ہوگی۔ وہ سیاسیات، اجتماعیات، معاشرت و معیشت، اخلاق و تمدن سے ہر گندگی کو دور کرے گی۔ وہ عبادات و معاملات میں انفرادی و اجتماعی، مادی و روحانی ہر طرح پاکیزگی اور ستھرائی کی راہیں کھولے گی۔ اور ہر شعبۂ حیات کو نورانیت و لطافت سے بھر دے گی۔

(۵۸)

اسی سورۂ اعراف میں پیمبروں اور خصوصاً سلسلۂ موسوی کی بعض تفصیلات بیان کرنے کے بعد ذکر کسی خاص شخصیت کا آیا ہے، جس نے دینی نعمتوں سے مالا مال ہونے کے بعد بھی، راہِ شقاوت و بدبختی اختیار کرلی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝ (آیت ۱۷۵)

اور ان لوگوں کو اُس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے کہ اس کو ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، سو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، اور وہ گمراہوں میں ہو گیا۔

یہ شخص کون تھا، کہاں کا تھا، کس قوم اور زمانہ کا تھا، یہ کچھ متعین نہیں۔ اور جب قرآن اس باب میں ساکت ہے، تو کسی شخص کی تعیین پر جزم و اصرار بھی صحیح نہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اشارہ رسول اللہ ہی کے ایک معاصر امیہ بن ابی الصلت کی جانب ہے، اور دوسری جماعت اکابر کا خیال ہے کہ اشارہ بنی اسرائیل کا ایک معلوم و معروف زاہد، بلعم باعور کنعانی کی جانب ہے۔ اس کا ذکر توریت کے صحیفہ گنتی کے باب ۲۲-۲۳-۲۴ میں تفصیل سے

ساتھ آیا ہے۔

بہر حال وبہر صورت جب انسان اپنے ارادہ سے فسق اختیار کرلیتا ہے تو شیطان اس کے ساتھ مستقل رفاقت قائم کرلیتا ہے، گویا اس پر سوار ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ج (آیت ۱۷۶)

اور ہم چاہتے تو اس کا مرتبہ ان نشانیوں کے ذریعہ اونچا کر دیتے لیکن وہ زمین کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی خواہش نفسانی کی پیروی کرنے لگا۔

"زمین کی طرف مائل ہوگیا" یعنی اپنے قصد و اختیار سے دنیا کی پستیوں کی طرف جھک پڑا، اور یہ اس لئے ہوا کہ اُس نے عقیدہ و عمل کا معیار، بجائے وحی الٰہی کے، اپنے نفس کو قرار دے لیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا: یعنی اگر ہماری مشیت تکوینی یہی ہوتی کہ ہم بندہ کو بہر حال وبہر صورت مجبور کر کے حسنِ عمل کی توفیق دیتے ہی رہتے تو بندے کے ارادے میں دخل دے کر اسے بہ جبر سیدھی راہ پر ڈال دیا کرتے۔ لیکن یہ قانون ہم نے اپنا رکھا ہی نہیں ہے۔

(۵۹)

سورۂ انفال اگرچہ مجموعی حیثیت سے احکام کی سورۃ خصوصاً احکام جہاد و مسائلِ قتال کی ہے۔ اس میں ایک موقع پر ایمان والوں کا تعارف کرایا گیا ہے اور ان کی شناخت تفصیل سے بیان کر دی گئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (آیت ۲)

ایمان والے تو بس وہ ہوتے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل سہم جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر توکل رکھتے ہیں۔

پہلی چیز یہ معلوم ہوئی کہ ان کے دل عظمتِ الٰہی کے استحضار سے سہم جاتے ہیں، اور یہی حاصل ہے تقوےٰ کا۔

خوفِ خدا و خشیتِ الٰہی کی تاکید اگلے صحیفہ میں بھی ہے، چنانچہ یرمیاہ نبی کے صحیفہ کے پانچویں باب کی دوسری آیت ہے:

"خداوند کہتا ہے، کیا تم مجھ سے نہیں ڈرتے ہو؟ کیا تم میرے حضور میں نہیں تھرتھراتے؟"

اور انجیل جو سراسر رحمت و شفقت کی سمجھی جاتی ہے، اس کے بھی صحیفۂ مکاشفہ پندرھویں باب کی چوتھی آیت میں ہے:

"اے خداوند! کون تجھ سے نہ ڈرے گا، اور کون تیرے نام کی بڑائی نہ کریگا؟ کیونکہ صرف تو ہی قوی ہے"

اور آیتیں سن کر ان کا ایمان بڑھنے لگتا ہے، قوتِ ایمان کی تازگی کے لحاظ سے ــــ یہ بیان ہوا مومنین کے صفائے قلب کا ــــ اور وہ ہر حال میں اللہ پر توکل رکھتے ہیں، یہ بیان ہوا ان کی عملی حالت کا

آگے مزید تشریح ارشاد ہوتی ہے:

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَمَغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ۝ ج (آیت ۳-۴)

اور یہ لوگ نماز کی پابندی رکھتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ انھیں دے رکھا ہے

اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ تو سچے (اور پکے) مومن ہیں۔

ان کے لئے پروردگار کے پاس مغفرت ہی مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔

یعنی حقوق اللہ میں سے نماز اور انفاق، یعنی حقوق بدنی اور حقوق مالی، دونوں کی ادائی کا پورا اہتمام رکھتے ہیں، اور محققین نے لکھا ہے کہ اعمال باطنی میں توکل اور اعمال ظاہری میں نماز و زکوٰۃ کے تصریحی ذکر سے اشارہ یہ بھی نکلتا ہے کہ باطنی اور ظاہری زندگی میں یہی اعمال سب سے زیادہ اہم اور قابل اہتمام ہیں۔

ہمارے موجودہ دور کے لوگوں کے لئے یہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے بہترین اعمال ظاہری و باطنی کہہ کر کیا چیزیں پیش کی تھیں، اور خود وہ، اپنے کن گڑھے ہوئے اعمال کو کمال زندگی اور کمال اسلام سمجھ رہے ہیں!

لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ، اور یہی نص ہے اس پر کہ جیسا کامل ان حضرات کا ایمان ہے، ویسے ہی جزا بھی انھیں کامل ہی ملے گی۔

(۴۰)

ایک ہلکی سی جھلک لیکن بڑی پر مغز، معنی خیز، مشرکین جاہلی کی عبادت کی بھی دیکھتے چلئے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ (آیت ۳۵)

اور ان کی نماز بس خانہ کعبہ کے پاس کیا تھیں؟ بجز سیٹی بجانے اور تالیاں بجانے کے۔ سو عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کی پاداش میں۔

دوسرے اعمال جاہلی جیسے تھے، وہ تو خیر تھے ہی۔ ان کی نماز اور سب سے بڑی عبادت وہی کیا تھی، بجز خانہ کعبہ کے گرد ایک قسم کے لہو و لعب کی منہ سے سیٹیاں اور

ہاتھوں سے تالیاں!

خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے کہ آج بھی جو غیر اسلامی اور جاہلی طریقے جاری و رائج ہیں، ان کا جزو اعظم یہی باجا گاجا، تالیاں اور سیٹیاں، اور انھیں سے ملتی جلتی شکلیں کھیل تماشہ کی ہیں یا نہیں؟ قرطبی وغیرہ فقہائے مفسرین نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ اس میں وعید ہے ان جاہل صوفیا کے لئے جو وجد و حال لا کر اُچھلنے کودنے، تالیاں بجاتے اور ناچتے ہیں، اور اس کو کمال روحانی سمجھے ہوئے ہیں۔

آیت کے آخری ٹکڑے میں مشرکین کو جس عذاب کی وعید ہے وہ تو اس دنیا میں اس طریقہ سے پوری ہو گئی، خارق عادت نہیں، موافق عادت الٰہی، غزوات و جہاد کے ذریعہ سے اور مشرکین کا قلع قمع چند ہی سال کے اندر ہو کر رہا۔

(۶۱)

اسلام میں قتال اب شروع ہو گیا ہے اور ۱۳، ۱۴ سال کے پورے صبر و تحمل، اور ہر طرح کی مظلومیت جھیل لینے کے بعد، اب اجازت پہلی بار مل رہی ہے قتال کی۔ بلکہ طریقہ اور مقصد بھی قتال کا بتایا جا رہا ہے۔ اہم ترین غزوہ، غزوۂ بدر ہوا ہے۔ اس میں مسلمانوں کو مالِ غنیمت بھی وصول ہوا۔ اُس وقت اس مال کی تقسیم کے احکام بھی ذرا غور سے سُن لیجیے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (آیت ۴۱)

اور جانے رہو کہ جو کچھ تمھیں بطور مالِ غنیمت حاصل ہوا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول کے لئے ہے، اور (رسول کے) قرابت داروں کے لئے اور یتیموں

کے لئے، اور مسکینوں کے لئے۔ اور اگر تم اللہ اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جس کو ہم نے نازل کیا اپنے بندہ (محمدؐ) پر فیصلہ کے دن دونوں جماعتیں مقابل ہوئیں اور اللہ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

غنیمت کے لغوی معنی بہت وسیع ہیں۔ یعنی ہر اس چیز کے، جو انسان اپنی کوشش سے حاصل کرے۔ لیکن ایک محدود اور اصطلاحی معنی میں اس کا اطلاق، صرف اس مال پر ہوتا ہے جو کافروں سے حالت جنگ میں بہ زور و قوت حاصل ہو۔ اس کا ۴/۵ حصہ غازیوں میں تقسیم ہوگا اور ۱/۵ حصہ اللہ کی نذر ہوگا۔ یعنی آج کی بولی میں یہ حصہ اسلامی اسٹیٹ کا ہوگا، اور اسلامی سرکاری خزانہ میں داخل ہوگا۔ فقہ حنفی کی کتابوں (ہدایہ وغیرہ) میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ تقسیم میں یہ اللہ کا نام محض خیر و برکت کے لئے آیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی ملک و ملوک تو دنیا کا ہر مال ہے۔ اس کے بعد رسولؐ کے حصہ کا جو ذکر ہے تو سمجھ لیجیے کہ یہ حصہ کوئی الگ نہیں۔ یعنی اللہ اور رسول کے دو حصے الگ الگ نہیں، بلکہ کل ایک ہی حصہ ہے۔ جو رسول کے زمانہ حیات میں ان کی خدمت میں پیش ہوتا تھا۔ نائب الٰہی اور خلیفۃ اللہ کی خدمت میں اس کا پیش ہونا، اللہ ہی کے حضور میں پیش ہونا تھا۔ سرکاری ۱/۵ کا یہ پانچواں حصہ، یعنی کل کا ۱/۲۵ حصہ، خوب سمجھ لیجیے کہ اُس کو مل رہا ہے، جو ایک ہی وقت میں آمر حکومت بھی تھا، اور امیر عسکر بھی اور حامل رسالت بھی!

وفات شریف کے بعد یہ حصہ بھی فقہ حنفی کے مطابق ساقط ہو گیا۔ اور خود خلفائے راشدین کا طرز عمل فقہائے حنفیہ ہی کی تائید میں رہا، کہ انھوں نے رسول کا حصہ اپنی طرف منتقل نہیں کر دیا۔ دوسرا حصہ اقربائے رسول کا ہوا۔ (پہلا حصہ اللہ اور رسول کا ملاکر تو ایک ہی تھا) یہ جاں نثاروں کا وہ گروہ تھا، جس نے مکہ سے لے کر مدینہ تک ہر حال میں، ہر مصیبت میں ساتھ دیا تھا۔ اور فقہائے حنفیہ نے صراحت کر دی ہے کہ یہ حصہ نصرت قدیم کی بنا پر تھا، نہ کہ عزیز داری کی بنا پر۔ ہدایہ میں صاف ہے: ان المراد من النص قرب النُّصرة

لاقرب القرابۃ ۔ بعد وفاتِ نبوی، یہ حصہ بھی ساقط ہو گیا۔ اس کے بعد اُمت کے یتیموں کی کفالت و سرپرستی کا حصہ تیسرا حصہ ہوا۔ چوتھا حصہ اُمت کے مسکینوں یا ناداروں کا ہوا۔ وابن السبیل میں مسافروں کا حصہ، شاید آج دنیا کی نظروں میں بہت کھٹکے لیکن اونچے ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے، اور اونچے درجوں میں سفر کرنے والے، اور اعلیٰ موٹروں پر سفر کرنے والے، عام مسافروں کی حاجتمندی اور مصیبت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے، جنھیں پیدل یا گھوڑے، یا اونٹ کی سواری پر منزلوں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں، یا سردیوں کی کڑکڑاتی ہوئی راتیں گزارنا پڑتی ہیں۔ اور جن ملکوں میں چھوت چھات کا دور دورہ ہے، وہاں کے دیہات میں غریب پردیسیوں پر کیا گزرتی رہتی ہے وہ اس کا تو اندازہ بھی نہیں کر سکتے

اس طرز تقسیم کو آج کی عینک سے بھی خوب غور کر کے دیکھ لیا جائے۔ سرکاری خزانہ کا ۳/۵ ہی نہیں پورے کا پورا ۵/۵، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی غریب نواز و ہمدرد عوام حکومت میں رعایا کے سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقوں (یعنی لاوارث یتیموں، محتاج مسکینوں اور بے زادراہ مسافروں، پردیسیوں) کے لئے وقف ہے؟

اور آیت میں جو تلمیح یوم الفرقان یا فیصلہ کے دن کی ہے، وہ معرکۂ بدر کی جانب ہے، جب حق و باطل کے درمیان عملی اور حتمی فیصلہ سب کے مشاہدہ میں آگیا، اور کفر و اسلام کے درمیان اسی پہلی مادی ٹکر نے دنیا کی تاریخ میں ایک کامیاب انقلابی دعوت کی بنیاد قائم کر دی۔ یہ جنگ رمضان سنہ ۶۲۴ عیسوی میں لڑی گئی اور مسلمان یعنی داعیان توحید اپنی بے سر و سامانی کے ساتھ کل ۳۱۳ کی تعداد میں تھے، اور مشرکین مکہ سواری اور ہتھیار کے سازو سامان کے ساتھ ۹۵۰ کی تعداد میں .....

اَنْزَلْنَا (جو کچھ ہم نے اُتارا) یعنی قوت غیبی۔ اور یہ ایجاز ہر تفصیل کا جامع ہے۔

عَلٰی عَبْدِنَا: انتہائی تشریف و تخصیص کے موقع پر رسول اللہ صلعم کا ذکر اس

عنوان سے کرنا، قرآن کریم کی بلاغت کا ایک خاص جزو ہے۔ آیت کے آخری جزو وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں افرادِ امت کو تنبیہ ہے کہ ۴/۵ جو تمہیں مل رہا ہے، اسے اپنی قوتِ بازو کا نتیجہ نہ سمجھو، اللہ جو ہر چیز پر قادر ہے، اسے اس کے فضل خاص کا نتیجہ سمجھو

(۶۲)

اس حرب وضرب والی سورۃ میں دو نکتے، چلتے چلاتے ایسے بیان کر دئیے ہیں جو امت کے لئے رزم و بزم کی ہر کشمکش میں مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ پہلے نکتہ کا تخاطب براہ راست امت سے ہے، اور دوسرے کا، خود رسولؐ سے پہلے پہلا نکتہ ملاحظہ ہو:۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آیت ۴۵)

اے ایمان والو جب تم سے کسی جماعت سے مڈبھیڑ ہو کر رہے، تو تم ثابت قدم رہا کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو تاکہ فلاح یاب رہو۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (آیت ۴۶)

اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی، اور آپس میں جھگڑا مت کیا کرو، ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے، اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرتے رہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہ عین موقع قتال کا ہے۔ دشمن کی فوج سامنے کھڑی ہے۔ حکم یہ نہیں ہوتا، مہذب قوموں کی طرح کہ اپنی قوم کے فخر و فتحمندی کے گیت گاؤ، بلکہ یہ کہ اللہ کا ذکر کرو کہ قلب میں قوتِ ثبات اس سے ہوگی اور قدم بھی اسی سے جمے رہیں گے۔ اور کوئی نزاع ہرگز

نہ پیدا ہونے دو نہ افرادِ اُمّت کے درمیان، نہ اپنے امیرِ لشکر یا قائدِ ملت سے، کہ یہ اندرونی کشمکش، ڈسپلن، (نظم یا اطاعت) کے حق میں زہرِ قاتل ہے۔

فَتَفْشَلُوْا: انتشارِ قوت کا لازمی نتیجہ پست ہمتی ہے۔ اور دشمنوں پر جو رعب تمہاری یک دلی و یک جہتی کی بنا پر قائم ہوا ہے، وہ یقیناً جاتا رہے گا۔

وَاصْبِرُوْا یعنی جو ناخوشگوار و ناموافق حالات گردوپیش میں پیدا ہوتے رہیں، ان پر بہرحال صبر سے کام لیتے رہو۔ صبر، محمود تو ہر حال میں ہے، موقعِ قتال پر اور زیادہ۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ: جزم اور قطعیت کے ساتھ فرما دیا گیا ہے کہ مومنینِ حق کا خود خدا معینِ نُصرت رہتا ہے۔

دوسرا اُصولی نکتہ اس سے بھی زیادہ اہم و ضروری اور زندگی کے انفرادی و اجتماعی دونوں شعبوں میں کام آنے والا، محض ضمناً، انگریزی محاورہ کے مطابق ....

By The Way یا، راہ چلتے، یہ ارشاد ہو گیا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ
حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (آیت ۵۳)

یہ سب اس سبب سے کہ اللہ کسی نعمت کو جس کا انعام وہ کسی قوم پر کر چکا ہے، نہیں بدلتا، جب تک وہ لوگ اس کو بدل نہ دیں جو ان کے پاس ہے، اور بیشک اللہ خوب سُننے والا، خوب جاننے والا ہے۔

یعنی کوئی نعمت جو کسی قوم کو مل چکی ہوتی ہے، وہ اس سے چھین نہیں لی جاتی جب تک وہ قوم اپنی حالت اُس سے مختلف نہ کر لے، جو نزولِ نعمت کے وقت تھی۔ اپنے اندر بجائے ایمان و اطاعت کے کفر و نافرمانی اور خباثت نہ پیدا کر لے۔ نعمت اور خُبث کا اجتماع خلافِ حکمتِ الٰہی ہے۔ اس لئے پہلے خُبث پیدا ہو لے گا، جب جا کر سلبِ نعمت ہو گا۔

اور نعمت کا مفہوم عام ہے۔ دنیوی، اُخروی، انفرادی و ملی، مادی و روحانی سب ہی قسم کی

نعمتیں اس میں آجاتی ہیں ۔ ہم آپ اگر اللہ کے بتائے ہوئے اسی ایک قانونِ تکوینی کے مفہوم کو اپنے دلوں میں اُتار لیں تو آج ہمارے کتنے بگڑے ہوئے کام بن جائیں ۔

(۶۳)

اتحادِ ملت کو ہم آپ، چاہے کوئی معمولی درجہ کی چیز سمجھ رہے ہوں، لیکن کتابِ الٰہی کی نظر میں وہ اللہ کی ایک بہترین و افضل ترین نعمت ہے ۔ اور اس کا ذکر تاکیدِ خصوصی کے ساتھ کیا گیا ہے ۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ (آیت ۶۳)

وہ وہی ہے جس نے آپ کو (اے رسول) اپنی نصرت سے اور مومنین کے ذریعہ سے قوت دی، اور ان کے دلوں میں اتحاد پیدا کر دیا۔ اگر آپ دنیا بھر کے مال خرچ کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں اتحاد نہ پیدا کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں اتحاد پیدا کر دیا۔ بیشک وہ بڑا قدرت والا، بڑا حکمت والا ہے۔

رسول کی ظاہری نصرت تو ظاہر ہے کہ مومنین ہی کے واسطہ سے ہوتی رہی۔ اور معنوی و باطنی نصرت، نصرتِ غیبی کی کسی نہ کسی شکل سے۔ مثلاً کبھی نزولِ ملائکہ سے۔ اللہ کی کریمی اور کارسازی ہی تھی کہ اُس نے مومنین کے دل سے دوسری کی رنجشیں، اور کدورتیں مٹا کر سب کو اطاعتِ دین پر یکجا و متفق کر دیا۔ بغیر اس یک جہتی کے نصرتِ دین ممکن ہی نہ تھی۔ اور رسولؐ کو خطابِ خصوصی کر کے جو ارشاد ہوا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دنیا بھر میں سب سے بڑھ کر صاحبِ حکمت و صاحبِ تدبیر ہیں، آپ تک، سارے ممکن مالی ذرائع استعمال کر کے بھی، نعمتِ اتحاد و اتفاق پر قادر نہ ہو سکتے۔ یہ تو محض فضلِ الٰہی کی کرشمہ سازی تھی۔ اللہ کی یہ نعمت کتنی اہم

عظیم ہے، یہ اس کلام سے ظاہر ہے۔

وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ وہ اپنی قدرت و قوت سے جو چاہے، اور اپنی حکمت سے مناسب طریق پر چاہے کر دکھائے۔

(۶۴)

اب آپ سورۂ براۃ یا سورۃ التوبہ پر آ گئے، اور یہیں وہ آیت ملتی ہے جو منجملہ قرآن مجید کی اُن چند آیتوں کے ہے جو مستشرقین کے طعن کی ہدف ایک مدت دراز سے بنی چلی آ رہی ہیں۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ اسے جو کچھ کہنا ہوتا ہے اسے (بہ قول حضرت تھانوی) بے دھڑک کہہ ڈالتا ہے بلا لحاظ اس کے کہ سننے والے کیا رائے قائم کریں گے۔ وہ لاکھ کیڑے ڈالیں، تمسخر کریں بہر حال واقعہ، واقعہ ہی رہے گا، اور حقیقت آخر کار حقیقت ہی ثابت ہو کر رہے گی۔

قرآن مجید نے عقیدۂ ابن اللٰہیت کا الزام جس طرح مسیحیوں پر لگایا ہے، اسی طرح یہودیوں پر بھی۔ اور مستشرقین کی طرح یہود اس سے بھڑک رہے ہیں اور کان پکڑ کر کہہ رہے ہیں کہ حاشا یہ ہم پر اتہام ہے۔ ہم سدا کے موحد ہیں، اور ہم خدا کی بیوی بیٹا کیا جانیں۔

بات، ذرا دیر میں صاف ہو گی اور جرم کے ثبوت اور پھر صفائی کی پیشی میں کچھ وقت لگے ہی گا۔ سامعین ذرا صبر و تحمل کے ساتھ سنیں۔

قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ
ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِــــُٔوْنَ
قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ڬ اَنّٰى

یُؤْفَکُوْنَ ٥ (آیت ۳۰)

یہود کہتے ہیں کہ عُزیر خدا کے فرزند (مجازی) ہیں، اور نصرانی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے فرزند (مجازی) ہیں۔ یہ ان کا قول ہے محض منھ سے بک دینے کا۔ یہ انھیں لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے قبل کافر ہو چکے ہیں اور اللہ انھیں ہلاک کرے، کہ کدھر بہکے جا رہے ہیں۔

سب سے پہلے عُزیر، عبرانی تلفظ میں عزرا کی شخصیت سے تعارف حاصل کر لیجیے۔ اسرائیل کے مذہبی نوشتوں میں ان کی شہرت کاتب توریت کی حیثیت سے ہے۔ سال وفات غالباً ۴۵۸ ق م۔ بخت نصر متوفی ۵۶۱ ق م، تاجدار ایران و عراق نے جب یہود پر حملہ کر کے انھیں، کامل طور پر تباہ و برباد کر دیا۔ تو ایسی سخت مصیبت کے عالم میں خود توریت کے نسخے بھی ان کے پاس سے یکسر گم ہو گئے۔ تقریباً ایک صدی اسی طرح گزر گئی۔ بالآخر انھیں عُزیر نبی نے توریت کو اپنی یادداشت سے دوبارہ لکھ دیا۔ اور اُمت یہود اس احسان عظیم کے بعد انھیں مثیل موسیٰ ماننے لگی۔ اور بعض نے غلو کر کے انھیں اس مرتبہ سے بھی بڑھا دیا

اب دوسری بات یہ غور سے سمجھنے کی ہے کہ قرآن میں لفظ ابن اللہ آیا ہے ولد اللہ نہیں۔ اور عربی میں ابن اور ولد الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں جیسے اُردو میں لڑکا اور بیٹا، یا انگریزی میں اور بائبل کے خاص محاورہ میں ایک Child of God دوسرا Son of God۔ ابن اللہ Child of God سے مراد صلبی یا حقیقی فرزند نہیں ہوتا، بلکہ خدا کا فرزند معنوی، مجازی، یا لاڈلا یا چہیتا ہوتا ہے۔ قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ اہل کتاب ہی کی زبان سے فقرہ نقل ہوا ہے۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ۔ یہاں ابناء کا عطف اَحِبَّآؤُہٗ پر ہے، اور کھلے ہوئے معنی فرزند مجازی یا لاڈلے چہیتے کے ہیں۔ یہود اس معنی میں حضرت عُزیر کو مطاع کل اور محبوب خدا مانتے

اور ابن اللہ یا Child of God سے موسوم کرتے ۔

مسیحیت کی دو بنیادی گمراہیاں الگ الگ ہیں۔ ایک شدید، دوسری اَشد یا شدید تر۔ ایک حضرت مسیح کو اللہ کا ولد یا بیٹا Son of God ماننا، اس عقیدہ کا ذکر جہاں قرآن میں آیا ہے، بہت ہی سخت لہجہ کے ساتھ آیا ہے ....، تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ (قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑے) وغیرہ۔

دوسری گمراہی ہے مسیح کو ابن اللہ Child of God قرار دینا۔ یہ گمراہی بھی اگرچہ سخت اور مہلک ہے، پھر بھی ولد الوہیت کا عقیدہ اس ابن الٰہیت سے کہیں اشد ہے۔ یہود اس شرک جلی تک بے شک نہیں پہونچے۔ لیکن قرآن انھیں اس کا مجرم ہی کب قرار دیتا ہے۔ البتہ ابن الٰہیت میں کسی حد تک وہ مسیحیوں کے ہم سطح ہو گئے اس فرق دقیق کے نکتہ تک ہمارے بعض مفسرین پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ بحر المحیط میں یہ قول نقل ہوا ہے، اور ابن عطیہ کے حوالہ سے تفسیر قرطبی میں بھی، کہ اسماء ابنیت سے مراد نسلی و نسبی فرزندی نہیں، بلکہ محض لاڈ اور پیار والی فرزندی مراد ہے، اور خود یہ عقیدہ بھی کفر ہی ہے۔ یہ ابنیت والی گمراہی، یہود اور نصرانیوں، دونوں میں مشترک ہے۔ اور نہ صرف انھیں دونوں میں، بلکہ یونان، مصر وغیرہ کی بہت سی قدیم وجاہلی قوموں میں۔

ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ: محض ایک بکواس ہے۔ جو ان لوگوں نے بک ڈالی ہے، جسے حقیقت وواقعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ فقرہ کلام کو ٹھوکدار اور زوردار بنانے کے لئے لایا گیا ہے۔

يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ: یعنی اس مہمل عقیدہ پر ان کے پاس تو کوئی دلیل ہے نہیں، نہ عقلی نہ دینی، یہ تو محض تقلید ہے، ان کافر قوموں کی جو ان سے پیشتر ہو چکی ہیں، اور خدا کی تجسیم کی قائل ہو کر عقیدہ حلول کی ماننے والی ہوئی ہیں۔ اشارہ خصوصی مشرکین یونان کی جانب ہے کہ انھیں کے فلسوفوں کی خام خیالیوں سے

پہلی صدی مسیحی کے یہود و نصرانی دونوں متاثر بلکہ مرعوب ہو گئے۔ اور انھیں کے مشرکانہ تعلیمات کو برابر اپنے اپنے دین کا جزو بناتے چلے گئے۔ مسیحیت پر یونانی اور رومی مذہبوں کی گہرے چھاپ کی دریافت تو انیسویں صدی کے نصف آخر کے مغربی فاضلوں کاملوں کی خصوصی تحقیقات سمجھی جاتی ہے۔ قرآن کے اس اعجاز کے قربان جائیے کہ اس نے صدیوں قبل جب Higher Criticism (تنقید عالیہ) کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ ایک اُمّی کی زبان سے دنیا کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا۔ آخری ٹکڑے قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ پر حیرت ذرا نہ کیجیے۔ یہ تو عین فطرت بشری ہے کہ زبان پر ایسے موقع پر سخت بیزاری، نفرت و غصہ کے الفاظ بے ساختہ آجاتے ہیں۔ جیسے یہی کہ "خدا غارت کرے"۔ قرآن مجید نے ایسا فقرہ پڑھنے والے کی زبان سے ادا کر کے اُس کے جذبات کی عین ترجمانی کا حق گویا ادا کر دیا۔

(۶۵)

اس سے ملتی ہوئی ایک اور گمراہی کا بیان قرآن مجید ہی کی زبان سے اسی سلسلہ میں سنتے چلیے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ (آیت ۳۱)

ان لوگوں نے اللہ کے ہوتے ہوئے اپنے علماء اور اپنے مشائخ کو بھی اپنا پروردگار بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ انھیں حکم صرف یہ دیا گیا تھا کہ ایک ہی معبود (برحق) کی عبادت کریں۔ کوئی معبود نہیں اس کے سوا۔ وہ پاک ہے اس سے جو شرک یہ اس کے ساتھ کرتے ہیں۔

یعنی اہل کتاب نے اپنے علماء و مشائخ کو ایسا مستقلاً صاحب اختیار مان رکھا ہے کہ گویا وہ جو چاہیں جائز ٹھہرائیں اور جس چیز کو چاہیں حرام قرار دے دیں۔ سارے اختیارات شریعت و قانون سازی کے گویا انھیں کو حاصل۔ مسیحیوں کے ہاں آج بھی پوپ (پاپائے روم) بہ حیثیت نائب مسیح یہ سارے اختیارات علانیہ رکھتا ہے اور پروٹسٹنٹ بھی عملاً سارے اختیارات چرچ (کلیسا) کو سپرد کئے ہوئے تھے، اور تالمود کی اب بھی جو اہمیت ہے، محتاج بیان نہیں

آیت کی تفسیر ماثور بھی یہی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ہے کہ نو مسلم عدی بن حاتم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اپنے مقتداؤں اور پیشواؤں کو خدا کب مانتے ہیں، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ حلال و حرام کے اختیارات اُن میں مان لینا، انھیں بھی خدائی ہی اختیارات دے دینا اور انھیں معبودیت کے مرتبہ پر پہنچا دینا ہے۔

آیت میں عوام مسلمانوں کے لئے بڑی عبرت موجود ہے۔ انھوں نے بھی مختلف اماموں اور مشائخ کو مستقل مُطاع قرار دے کر عملاً انھیں معصومیت بلکہ خدائی کے مرتبہ پر پہنچا دیا ہے۔ قرآن کی روشن آیات کو اپنے ضمیر کی واضح شہادت کو، کُھلے ہوئے مشاہدہ کو سب چھوڑ دیں گے، لیکن اپنے شیخ کو کسی حالت میں نہ چھوڑیں گے۔ امام رازی نے یہاں پہنچ کر اپنے اُستاد کا قول نقل کیا ہے کہ میری نظر سے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جن کے سامنے میں نے اُن کے مسلک کے خلاف قرآن کی آیتیں سُنائیں، انھوں نے نہ سر تسلیم خم کیا، نہ انھیں قابل التفات خیال کیا، بلکہ اُلٹے حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے کہ ان کے اسلاف کے خلاف یہ آیات قرآنی کیوں کر ہو سکتی ہیں۔ اور تاویل بجائے ان کے اقوال میں کرنے کے خود آیات قرآنی میں کرنا چاہتے۔ امام صاحب اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں کہ غور سے دیکھئے تو اکثر اہلِ دنیا اسی بیماری میں مبتلا نظر آئیں گے۔

مسیحیت کی گمراہیوں میں علاوہ ابنیت الٰہی و اُلوہیت الٰہی کے ایک بڑی گمراہی

یہ تھی کہ مسیح کو مطاع مطلق سمجھتے۔ اور مطاع مطلق بھی بالکل اور براہ راست، حق تعالیٰ کے مساوی اور ہم مرتبہ اور ان کی مطاعیت چونکہ یورپ اور کلیسا کی مطاعیت سے الگ، اصلاً و مستقلاً تھی، اس لئے قرآن مجید نے اس کا ذکر بھی الگ کر کے کیا۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلٰهًا وَّاحِدًا: اور یہ توحیدِ خالص کا حکم، شرک جلی و خفی کی ہر صورت سے الگ رہنے کا حکم، آج تک توریت و انجیل میں بے شمار تصرفات و تحریفات کے باوجود لکھا چلا آرہا ہے۔ مثلاً توریت میں کہ "میرے حضور تیرا دوسرا خدا نہ ہووے"۔ دیکھیے صحیفہ خروج، باب ۲۰، آیت ۳۔ نیز صحیفہ استثناء باب ۵، آیت ۶) اور انجیل مرقس کے باب ۱۲۔ آیت ۲۹ میں ہے:

"سب حکموں میں اول کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے، اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے"۔

سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اللہ کی ذات پاک و برتر ہے، نہ صرف جاہلی مشرکوں کے کھلے ہوئے اور اجمالی شرک سے، بلکہ اہلِ کتاب کے باریک و خفی مختلف قسم کے شرکوں سے بھی۔

(۶۶)

سورۃ التوبہ کہنا چاہیے کہ قرآن مجید کی سب سے زیادہ جلالی سورہ ہے۔ احکام جہاد و قتال اور مشرکوں اور اہل کتاب، سب کے لئے وعیدوں سے لبریز۔ لیکن خاتمہ اس کا شانِ جمالی پر ہوتا ہے۔ اور جس نے خود اپنا نام رؤف و رحیم رکھا ہے، اس نے اپنے رسول صاحبِ جمال کو بھی یہاں اسی روپ میں پیش کیا ہے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (توبہ، آیت ۱۲۹)

بیشک تمھارے پاس ایک پیمبر آئے ہیں، تمھاری جنس میں سے۔ انھیں بہت گراں گزرتی ہے، جو چیز تمھیں مضرت پہنچاتی ہے۔ تمھاری بھلائی کے حریص ہیں۔ ایمان والوں کے حق میں بڑے شفیق ہیں، مہربان ہیں۔

پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں "تم" سے کون مراد ہے۔ اور ضمیر جمع مخاطب "تُم" دونوں جگہ کس کے لئے ہے؟ بعض نے لکھا ہے کہ مراد اہل عرب ہیں کہ آپ انھیں کے درمیان بھیجے گئے تھے۔ لیکن قول محقق یہ ہے کہ خطاب ساری نوع انسان سے ہے۔ اور آپ کی بعثت تنہا عرب کی جانب نہیں، سارے عالم کی جانب تھی۔ کبیر اور روح المعانی دونوں میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ الخطاب للبشر علی الاطلاق۔ اور قرطبی نے یہ قول ایک مشہور امام لغت زجاج کی جانب منسوب کیا ہے۔ مشرک قوموں اور شرک مزاج گروہوں کی سمجھ ہی میں یہ نہیں آتا تھا کہ منصب رسالت پر کوئی بشر کیسے مامور ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کی بشریت پر بار بار زور دینا اسی گمراہی کے رد میں ہے۔

عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ: آپ کے مزاج کی خصوصیت یہ تھی کہ جو چیزیں پشت در پشت انسانیت کو نقصان پہنچانے والی ہیں، وہ آپ کو سخت گراں گزرتی تھیں، اور آپ کے دل پر ان کا بار رہتا تھا۔ اور آپ کو انسانی فلاح و بہبود کا جیسے ہُوکا رہتا تھا۔ تو جب آپ کی یہ شفقت ساری خلق اللہ کے لئے تھی، اور آپ کے دل میں درد نوع انسانی کے لئے تھا۔ تو خاص مومنین کے ساتھ آپ کے درجۂ رافت و کرم، درجۂ شفقت و تعلق قلب کو کون پا سکتا ہے؟

بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ اسی درجۂ تخصیص کے اظہار کے لئے ہے۔ رافت و رحمت تو خدا کی صفات و القاب ہیں۔ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کا لقب آپ کے سوا اور ملِ کس کو سکتا تھا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ

تَوَکَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ۝ (آیت ۱۳۰)

اب بھی یہ لوگ اگر روگردانی کئے رہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لئے تو اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔

جب عرش الٰہی موجودات عالم میں سب سے عظیم تر ہے، تو جو اس کا مالک و پروردگار ہے، اس کی ماتحتی اور ملک کامل میں سارے موجودات عالم کا ہونا بالکل ظاہر ہے ــ تو یہ لوگ اگر یہ سب کچھ جاننے بوجھنے کے بعد بھی انکار حق پر قائم رہیں، تو آپ کہہ دیجئے کہ میرا حافظ و ناصر تو مالک حقیقی ہے۔ مجھے تمہارے انکار و اعراض سے ضرر کیا! میرا تکیہ اسی ذاتِ عظیم پر ہے، نہ کہ اپنے نفس پر، یا کسی اور کی ذات پر۔

اور اسی پر اس سلسلۂ معروضات کا اختتام ہے۔

خیال یہی تھا، اور یہی دلی تمنا تھی کہ کلام پاک کے جتنے مقامات بیسویں صدی عیسوی کے ایک طالب علم کی نگاہ میں قابل بحث نظر آئیں، اور جہاں جہاں اس کی نگاہ ٹھٹکے اور قلب کچھ بھٹکے، سب ایک لڑی میں پرو کر ناظرین باتمکین اور سامعینِ صدر نشین کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں اور اس کی برکت سے اشکالات کے حل مل جائیں اور شک و شبہ کی راہ کے کانٹے نکل جائیں ــ دلی رنج و قلق اور بڑی ہی گہری شرمندگی و حسرت کے ساتھ عرض ہے کہ مطالعہ پورے قرآن مجید کا کیا معنی، آدھے کا بھی نہ ہو سکا۔ اور راہ ایجاز و اختصار کی کوشش کے باوجود احاطہ صرف ایک تہائی یا ثلث قرآن کا ہو سکا۔

معذرت جو اہی آپ ہی کے لطف و کرم سے ہے، اور عجب نہیں کہ ایک بندۂ حقیر و نادان کی یہ محض طالب علمانہ کوشش آئندہ کے کسی فاضل و جیّد مفسّر

کے لئے ٹمٹماتی ہوئی روشنی کا کام دے جائے۔ اور وہ اسی کی بنیاد پر ایک پورا منارۂ نور قائم کر جائے۔

برادرانِ ملّت! اب رخصتی کا سلام قبول فرمائیں۔ اور حشر میں جب ملاقات ہو تو اِدھر سے معروضات کی تشنگی کا اعتراف ہو، اور اُدھر سے آپ کی قدر افزائی کے الفاظ ہمت اور حوصلہ پیدا کر رہے ہوں، اور رحمتِ الٰہی اپنی بارش سے ہم کو، آپ کو سب کو ڈھانپ لے!